سوچ نگر کا مسافر

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

سوچ نگر کا مسافر

☆ ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

☆☆☆☆

وہ کالج کے گیٹ سے نکل کر راستہ پار کرتی ہوئی دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر جانا چاہتی تھی اگر شہر یار فوراً ہی بریک نہ لگاتا تو وہ کار کی زد میں آ جاتی۔ یک بیک موت کو سامنے دیکھ کر وہ بدحواس ہوگئی تھی' کتابیں اور کاپیاں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر سڑک پر بکھر گئی تھیں۔ چاند سے مکھڑے پر ذرا سا خوف طاری ہو جائے تو اس کے حسن میں کتنی دلکشی آ جاتی ہے' یہ شہر یار دیکھ رہا تھا ، اور ایسی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ کار ریسنگ کے مقابلہ کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد لڑکی کے حواس بجا ہوگئے' وہ جلدی سے جھک کر اپنی کتابیں اور کاپیاں اٹھانے لگی۔ دو لڑکیاں اس کے قریب آ گئی تھیں اور اسے سمجھا رہی تھیں کہ راستہ دیکھ کر پار کرنا چاہیے۔

کالج کے گیٹ سے طلباء و طالبات اپنی اپنی کاروں میں اور یونیورسٹی کی بس میں بیٹھ کر جا رہے تھے۔ اپنی کتابیں اور کاپیاں اٹھانے کے بعد وہ لڑکی دوسرے فٹ پاتھ پر آ گئی۔ اس کے ساتھ کی دو لڑکیوں نے اپنی کار میں بیٹھتے ہوئے اسے آواز دی۔

’’ریشم! میری کار میں آ جاؤ ۔تمہارے بھائی جان نہ جانے کب آئیں گے؟‘‘

ریشم جھینپتی ہوئی کنکھیوں سے شہر یار کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس نے لڑکی سے کہا۔

’’شکریہ! بھائی جان گاڑی لے کر ضرور آئیں گے۔ میں ان کا انتظار کروں گی۔‘‘

اسکی مترنم آواز شہر یار کے کانوں میں رس گھول رہی تھی، لڑکیاں اپنی کار میں چلی گئیں، دوسری طرف سے ایک پرانی مرسڈیز شہر یار کی گاڑی کے پیچھے آ کر رک گئی۔ اسمیں بیٹھی روبی نے پریشان ہو کر شہباز سے پوچھا۔

''یہ شہریار نے گاڑی کیوں روک لی؟۔''

''پتانہیں کیا بات ہے، ویسے اتنی لمبی دوڑ بیکار گئی۔ وہ اور اس کی کار دونوں ہی صحیح سلامت ہیں۔ آؤ ذرا چل کر پوچھیں کہ بات کیا ہے۔''

وہ کار سے اترنے لگے۔

شازیہ اپنے سر کی چوٹ کو بھول کر کبھی شہریار کو اور کبھی دور کھڑی ہوئی ریشم کو دیکھ رہی تھی اور فیصلہ کر رہی تھی کہ اب اسے کار سے اتر کر چھپ جانا چاہیے ورنہ اس کی جگہ وہ خوب صورت لڑکی لے لے گی۔

اس نے شہریار کے شانہ کو جھنجھوڑ کر کہا۔

''اسے کیا دیکھ رہے ہو۔ گاڑی چلاؤ۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

''گاڑی کیسے چلاؤں۔ اب مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ زندگی خوب صورت نظر آنے لگی ہے۔''

روبی، شہباز اور اس کے ساتھی نئی مرسڈیز کے قریب آ گئے۔ شہباز نے پوچھا۔

''کیا بات ہے شہریار! تم نے گاڑی کیوں روک دی۔''

شازیہ نے چڑ کر کہا۔

''آپ کے شہریار صاحب اس لڑکی کو دیکھ کر بازی بھول گئے ہیں۔ لیکن وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے۔ کالج کی طالبہ ہے اگر انہوں نے لفٹ لینے کی کوشش کی تو وہ سینڈل سے باتیں کرے گی۔''

شازیہ نے حیرانی سے کہا۔

''مائی گاڈ تم نے شہریار کو ایسی توہین آمیز بات کہہ دی ہے۔ یعنی تم چیلنج کر رہی ہو کہ شہریار اس لڑکی سے لفٹ نہیں لے سکے گا؟۔''

شہریار نے تیز نظروں سے شازیہ کو دیکھا اور اسٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر کہا۔

''تم مجھے سمجھتی کیا ہو۔ میں ابھی جا کر اس لڑکی سے باتیں کر سکتا ہوں۔''

شہباز نے نفی میں سر ہلا کر کہا

''نہیں شہریار ! کسی لڑکی سے باتیں کر لینا کوئی بری بات نہیں ہے۔کمال تو یہ ہے کہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے جاؤ۔''

شہریار نے جواب دیا۔

''میرے لیے کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔مگر افسوس، وہ اپنی کار کا انتظار کر رہی ہے ۔ورنہ میں اسے ضرور بٹھا کر لے جاتا۔''

روبی نے تائید کی۔

''ہاں ہے تو ماننے والی بات ہے کہ ایسی صورت میں وہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر نہیں جائے گی۔لیکن شہریار ! آزمائش کی بات آ ہی گئی ہے تو آج میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے گلفام ہو' وہ دیکھو، اس لڑکی نے اپنے بالوں میں ایک پھول لگا رکھا ہے۔تم وہ پھول اس سے مانگ کر لے آؤ۔''

ایک دوست نے کہا

''روبی ! یہ تو جوتے کھانے والی بات ہے۔''

شہریار ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔

''تم جیسے لوگ جوتے کھاتے ہیں۔دیکھو، میں کس طرح اس کی زلفوں سے پھول نکال کر لاتا ہوں۔''

اس دوران ریشم فٹ پاتھ سے اتر کر دوبارہ کالج کی طرف جا رہی تھی۔شہریار نے آگے بڑھتے ہوئے آواز دی۔

''ذرا سنیے!''

وہ چلتے چلتے بیچ سڑک پر ٹھٹک گئی۔پھر دور کھڑے ہوئے شہباز وغیرہ کو دیکھ کر تیزی سے کالج کی طرف بڑھنے لگی۔شہریار نے دوبارہ آواز دی۔

''مس ریشم ....''

اس کے قدم رک گئے۔وہ شہریار کو دیکھ کر حیرانی سے بولی۔

''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں۔؟''

وہ بھول گئی تھی کہ کچھ دیر پہلے اس کی سہیلیوں نے اسے نام لے کر پکارا تھا۔شہریار نے مسکرا کر کہا۔

''میں آپ کو اور آپ کے بھائی جان کو اچھی طرح جانتا ہوں' اگر شناسائی نہ ہوتی تو آپ کو مخاطب کرنے کی جرات نہ کرتا۔''

''آپ ہمیں کیسے جانتے ہیں۔؟''

''اس بات کو چھوڑیے کہ میں کیسے جانتا ہوں۔اس وقت میں آپ کو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ آپ جیسی سمجھدار طالبہ کو دیکھ سمجھ کر راستہ پار کرنا چاہیے۔''

''میں اپنی غلطی پر نادم ہوں اور آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ نے میری جان بچائی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔شہریار نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''صرف احسان ماننے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔آپ کو اس احسان کا بدلہ چکانا چاہیے۔''

وہ کالج کے گیٹ پر آ کر رک گئی اور گھور کر بولی۔

''کیا مطلب۔آپ اپنے احسان کا بدلہ چاہتے ہیں۔اچھی بات ہے بھائی جان کو آنے دیجیے۔وہ اپنی حیثیت کے مطابق آپ کو انعام دیں گے۔''

''دیکھئے، میں نے انعام کے لالچ میں احسان نہیں کیا ہے۔میں تو کچھ اور چاہتا ہوں۔''

وہ ذرا گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور ہچکچاتی ہوئی بولی۔

''آپ کیا چاہتے ہیں۔؟''

''وہ ،وہ پھول جو آپ نے بالوں میں لگا رکھا ہے۔'' وہ ایک قدم اور پیچھے چلی گئی۔

''کسی لڑکی سے اس طرح پھول مانگتے شرم نہیں آتی۔کیا آپ نے مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھا ہے۔''

''اس میں ایسی ویسی کیا بات ہے۔میں نے صرف پھول مانگا ہے۔آپ سے آپ کو تو نہیں مانگا۔''

''یوشٹ اپ! میں آپ کو ایک شریف انسان سمجھ رہی تھی۔''

''آپ ٹھیک سمجھ رہی تھیں۔میں ایک شریف آدمی ہوں۔اسی لیے میں نے آپ سے کوئی بہت بڑی چیز نہیں مانگی ہے۔ایک چھوٹا سا پھول طلب کیا ہے جو عام طور سے مفت مل جاتا ہے۔''

''مفت مل جاتا ہے تو جا کر کسی باغیچہ سے توڑ لیجیے۔ کیا آپ نے میری جان اسی لیے بچائی تھی کہ میں یہ پھول آپ کو دے کر مفت میں بدنام ہو جاؤں۔''

''لیکن آپ کو بدنام کون کرے گا۔؟''

''آپ کریں گے۔ یہ پھول لے جا کر اپنے دوستوں کے سامنے ڈینگیں ماریں گے کہ ایک لڑکی نے آپ پر مہربان ہو کر یہ پھول دیا ہے۔ میں نادان نہیں ہوں۔ آپ جیسے لوگوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

اسے ندامت سی محسوس ہوئی ۔ واقعی وہ اپنے دوستوں کو اپنا کمال دکھانا چاہتا تھا ۔ لیکن یہ بھول گیا تھا کہ اس طرح ایک شریف لڑکی بدنام ہو سکتی ہے۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ ایک طرف اسے پھول حاصل کرنا تھا۔ دوسری طرف اس سیدھی سادی حسینہ پر پیار آ رہا تھا' اس نے بے بسی سے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں ان لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ میرے لیے دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ اس طرح آپ بدنام ہو سکتی ہیں۔ بہر حال میں آپ کو تماشہ نہیں بناؤں گا لیکن میں اپنی ضد کا پکا ہوں۔ جس کام کا فیصلہ کرتا ہوں، اس پر ضرور عمل کرتا ہوں۔ میں یہ پھول ضرور حاصل کروں گا۔ لیکن نہیں، کیونکہ میں آپ کو بدنام نہیں کرنا چاہتا۔ کل یا پرسوں یا کسی بھی دن میں اپنی ضد پوری کروں گا۔''

ریشم غصہ سے بولی۔

''اچھی زبردستی ہے نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہو۔ میں موم کی بنی نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں سے خوفزدہ ہو کر اپنے ہاتھوں سے تمہیں پھول پیش کروں گی۔''

''تم اپنے ہاتھوں سے ہی پیش کرو گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور ایک مرد کا فصلہ کبھی نہیں بدلتا۔''

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور کوئی جواب سنے بغیر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا اپنی کار کی طرف جانے لگا۔

وہ ایسے ٹھوس لہجے میں چیلنج کر گیا تھا کہ ریشم تھوڑی دیر کے لیے دم بخود رہ گئی اور اس پر غصہ آنے کے باوجود اسے متواتر دیکھتی رہی۔ وہ اپنی کار کے پاس پہنچ گیا تھا' اس کے ساتھی اس کی ناکامی پر اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہاتھوں سے تالیاں پیٹ رہے تھے اور ہونٹوں سے پھرکیاں بجا رہے تھے۔

وہ بڑی خاموشی سے اپنی کار میں بیٹھ گیا۔لیکن کار چلانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہا ہے کیونکہ، اسنے ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کی تھی اور ایک زناٹے سے رفتار بڑھاتا ہوا نظروں سے دور ہوتا چلا گیا تھا۔

اور تب ریشم کو احساس ہوا کہ وہ اپنے دوستوں میں کس قدر ذلیل ہو کر رہ گیا ہے۔صرف اسے بدنامی سے بچانے کے لیے............اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے بالوں پر چلا گیا۔ جہاں وہ پھول لگا تھا اس کے کانوں میں شہریار کی آواز گونج رہی تھی۔

''تم اپنے ہاتھوں سے ہی پیش کرو گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور مرد کا فیصلہ کبھی نہیں بدلتا۔''

اس نے فوراً ہی پھول کو بالوں سے نکال لیا۔

اب وہ محض ایک پھول نہیں تھا' ایک کنواری لڑکی کا غرور تھا اور وہ اس غرور کو کسی قیمت پر نہیں گنوا سکتی تھی۔



بیگم بشارت غصہ کی حالت میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں' وہ جسامت کے لحاظ سے ایسی بھاری بھرکم تھیں کہ ٹہلنے کے دوران ڈرائنگ روم کے فرش پر دھماکے ہو رہے تھے۔ان کے آس پاس صوفوں کے پیچھے ایک ملازمہ اور دو ملازم ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

ایک ادھیڑ عمر کا شخص بغل میں فائلیں دبائے بیگم بشارت سے بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔لیکن کہنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔آخر بیگم بشارت نے ہی اس کی جانب پلٹ کر کہا۔

''نالائق گدھا کہیں کا۔''

ادھیڑ عمر کا شخص بوکھلا کر بولا۔''جج ،جی آپ مجھے کہہ رہی ہیں۔''

''کیا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ میں تمہیں کہوں گی۔تمہیں منیجر کس نے بنایا ہے اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں شہریار کو کہہ رہی ہوں۔''

''جی سمجھ گیا۔مگر بیگم صاحبہ ! وہ ابھی بچے ہیں۔انہیں پیار سے سمجھا دیجیے۔ وہ آئندہ ناول نہیں لکھیں گے۔''

''تم آئندہ کی بات کرتے ہو۔ میں پوچھتی ہوں کہ وہ ناول نگار کب سے بن گیا۔ یہ لکھنے لکھانے کا کام تو بھوکے ننگے لوگ کرتے ہیں۔ الٹی سیدھی کہانیاں لکھ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں، شہریار کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ وہ اس شہر کے سب سے بڑے اور عالی شان ہوٹل کا مالک ہے۔ لاکھوں روپے کا بنک بیلنس ہے۔ رہنے کے لیے یہ شاندار کوٹھی ہے، گھومنے کے لیے ہر سال نئے ماڈل کی کاریں خریدتا ہے۔ پھر یہ ناول لکھنے کی بیماری اسے کیسے ہوگئی۔؟''

''بیگم صاحبہ! یہ بیماری نہیں، شوق ہے۔ آج کل تو بڑے گھرانوں کی لڑکیاں بھی مشغلہ کے طور پر کہانیاں لکھتی ہیں۔''

وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بولیں۔

''شہریار میرا لڑکا ہے۔ لڑکی نہیں ہے کہ ان مشغلوں میں اپنا وقت ضائع کرے گا۔ لعنت ہے ایسے شوق پر۔ یہ دیکھو اس کا ناول پڑھ کر کسی نے یہ خط لکھا ہے کہ ناول لکھنا نہیں آتا ہے تو فضول جھک کیوں مارتے ہو، اس سے بہتر ہے کہ فٹ پاتھ پر چھولے بیچو، چار پیسے کما لو گے۔ ناول لکھنا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس خط میں ایسی توہین آمیز باتیں لکھی ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اس لڑکے کو ذرا شرم نہیں ہے۔ خاندان کی عزت مٹی میں ملا رہا ہے۔ آج میں اسے یہ خط دکھاؤں گی تاکہ کچھ تو اسے شرم آئے۔''

منیجر نے پریشان ہو کر کہا۔

''نہیں بیگم صاحبہ! آپ یہ خط انہیں نہ دکھائیں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ شہریار صاحب کو جس بات کے لیے چیلنج کیا جائے۔ وہ فوراً ہی اس چیلنج کو قبول کر لیتے ہیں۔ خط میں لکھا ہے کہ ناول لکھنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ پڑھتے ہی وہ دوبارہ ناول لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان کے لیے کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔''

بیگم بشارت سوچ میں پڑ گئیں، وہ غصہ میں بھول گئی تھیں کہ ان کا لاڈلا بیٹا کتنا ضدی ہے؟ جس کام کے لیے کہا جائے کہ وہ کر نہیں سکتا، اسے کسی نہ کسی طرح کر گزرتا ہے۔

انہوں نے سر ہلا کر کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔اگر اس نے یہ خط پڑھ لیا تو اس کے جواب میں پھر ایک ناول لکھنے بیٹھ جائے گا' اس لڑکے سے تو میں عاجز آ گئی ہوں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟''

منیجر نے کہا۔''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

''کیسا مشورہ...............؟''

''یہی کہ شہر یار صاحب ابھی جوان ہیں' میں نے سنا ہے کہ ناولوں میں عام طور سے جوان لڑکے اور لڑکیوں کی محبت کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔اگر آپ انکی شادی کر دیں تو وہ بیوی کی محبت پا کر کہانیوں کی فضول محبتوں کو بھول جائیں گے۔یا یوں سمجھئے کہ بیوی بچوں میں رہ کر انہیں کبھی ناول لکھنے کی فرصت نہیں ملے گی۔''

''اتنی سی عقل تو مجھے بھی ہے۔میں اس کی ماں ہوں میرے دل میں بھی ارمان ہیں کہ اس گھر میں بہو آئے مگر اسے تو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔ پہلے فرزانہ کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا پھر یہ کہہ کر اس سے جھگڑا کر بیٹھا کہ وہ لڑکی بدمزاج ہے۔اس کے بعد پروین سے میل جول بڑھ گیا۔خیر وہ تو مجھے بھی پسند نہیں تھی' اچھا ہوا کہ جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا۔اب سنا ہے کہ کسی شازیہ نام کی لڑکی کو پسند کر رہا ہے۔میں تو چاہتی ہوں کہ اب وہ جیسی بھی لڑکی ہو کسی طرح بہو بن کر آ جائے۔نہیں تو لڑکیاں پسند کرتے کرتے بوڑھا ہو جائے گا۔''

ان کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر سے شہر یار کی آواز آئی۔

''آ گئی ،آ گئی امی جان! آپ کے گھر کی رونق، آپ کے دل کا ارمان اور آپ کی دل پسند بہو بیگم آ گئی۔'' وہ دونوں بازو پھیلا کر آگے بڑھتا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تم نے کوئی دوسری لڑکی پسند کی ہے۔''

''جی ہاں یہ آخری ہے۔ایک دم فائنل ہے۔اس کے بعد میں کسی کو پسند نہیں کروں گا۔''

''تم ہمیشہ یہی کہتے ہو۔'' وہ غصہ سے بولیں پھر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگیں۔

''میں نہیں مانتی۔اگر وہ لڑکی پسند آ گئی ہے تو میں ابھی جاؤں گی اور اس کے والدین سے بات پکی کر لوں گی۔بتاؤ وہ کہاں رہتی ہے۔''

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

’’جی ایک طرف نہر بہتی ہے، دوسری طرف کالج ہے۔ان کے درمیان جو سڑک گزرتی ہے اسی سڑک پر وہ رہتی ہے۔فی الحال یہی پتا ہے۔‘‘

وہ جھنجلا کر رہ گئیں۔دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بولیں۔

’’تم گدھے ہو راستے میں رہنے والی کو میری بہو بنانا چاہتے ہو۔‘‘

’’یہ بات نہیں ہے امی۔میں نے اسے راستے میں دیکھا ہے۔ویسے اس کے رہنے سہنے کا کوئی ٹھکانہ ضرور ہوگا۔دو چار روز میں پوری معلومات حاصل کر کے آپ کو بتاؤں گا۔ارے ہاں! یہ آپ کے ہاتھ میں کاغذ کیسا ہے۔معلوم ہوتا ہے کسی کا خط ہے ۔ذرا مجھے دکھائیے۔‘‘

انہوں نے جلدی سے خط والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔یہ فیصلہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا کہ وہ خط شہر یار کو نہیں دکھایا جائے گا۔انہوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

’’یہ ، یہ تمہارا خط نہیں ہے۔‘‘

’’میرا نہیں ہے تو آپ کا ہوگا۔کسی انکل نے یا کسی آنٹی نے لکھا ہوگا کہ شہر یار اب جوان ہو گیا ہے۔جلدی سے کہیں اس کی شادی کر دو۔نہیں تو بری صحبت میں پڑ جائے گا۔‘‘

’’ہاں ، یہی لکھا ہے۔اگر تم نے دو دن کے اندر کوئی لڑکی پسند نہ کی تو میں اپنی پسند کی بہو تلاش کر کے لے آؤں گی۔‘‘

’’کیا یہ بات آنٹی نے لکھی ہے۔لائیے یہ خط میں پڑھ کر اس کا جواب لکھوں گا۔‘‘

’’تمہیں یہ خط نہیں ملے گا۔‘‘

’’تعجب ہے۔پہلے تو آپ کسی کا خط مجھ سے نہیں چھپاتی تھیں معلوم ہوتا ہے کوئی خاص بات ہے۔‘‘

منیجر نے آگے بڑھ کر کہا۔

’’شہر یار صاحب! خط کو چھوڑیے۔یہ ہوٹل کا حساب ذرا چیک کر لیجیے۔‘‘

’’آپ فائل رکھ کر چلے جائیے۔میں چیک کر لوں گا ۔ہاں تو امی! اس خط کے بارے میں کہہ رہا......‘‘

بیگم بشارت نے جھنجلا کر کہا۔

''لعنت ہے اس خط پر تم جس بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو اس کو بھولنا ہی نہیں چاہتے نہ جانے تم نے یہ ضد کہاں سے سیکھ لی ہے۔ تمہارے ابا جان تو ایسے نہیں تھے۔''

اسی وقت کال بیل کی آواز آنے لگی۔

شہر یار کا دھیان ہٹ گیا۔ وہ دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے منیجر سے کہا۔

''بشیر صاحب! ذرا دیکھیے کون آیا ہے۔''

منیجر بشیر ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر بولا۔

''پبلشر جبار صدیقی ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' شہر یار نے خوش ہو کر کہا۔

''انہیں اندر لے آیئے۔ دیکھیے امی! چاروں طرف میرے ناول کی دھوم مچی ہے۔ اب تو پبلشر بھی میرے دروازے پر آنے لگے ہیں۔''

''میں خوب سمجھتی ہوں کہ تمہارے ناول کی کتنی دھوم مچی ہے۔ یہ پبلشر محض تم سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھنے کے لیے تمہاری کتابیں چھاپتے ہیں۔ میرا کیا ہے............ ایک دن تم اپنی تمام دولت ناول نویسی میں ضائع کر دو گے پھر کوئی تمہارے دروازے پر نہیں آئے گا۔''

یہ کہہ کر وہ غصہ سے جھنجلاتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئیں، شہر یار بڑبڑانے لگا۔

''اسی کو کہتے ہیں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔ امی کی نظروں میں میری ناول نگاری کی کوئی قدر نہیں ہے۔ کبھی میرا ناول پڑھیں گی تو پتا چلے گا کہ ان کا بیٹا کتنا بڑا فنکار ہے۔''

پبلشر جبار صدیقی نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''بہت بڑے فنکار ہو برخوردار! تم چاہو تو بڑے بڑے پبلشروں کو کنگال بنا سکتے ہو مگر خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو، مجھے بربادی سے بچا لو۔''

شہر یار نے تعجب سے پوچھا۔

''ہائیں یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟''

جبار صدیقی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ دو ہزار کتابوں کا ایڈیشن شائع کیا تھا۔ جس میں سے صرف دس کتابیں فروخت ہوئی ہیں۔ باقی ایک ہزار نو سو نوے کتابیں گودام میں پڑی ہیں۔ اب تو یہ تول کر بیچی جائیں گی۔ کوئی انہیں خرید نا نہیں چاہتا ہے۔''

''جبار صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں' میں نے اتنی محنت سے ناول لکھا ہے' اسے تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونا چاہیے۔ کیا اس میں زبان یا املا کی غلطیاں ہیں۔''

''نہیں''

''کیا کہانی کے واقعات میں کچھ گڑ بڑ ہے؟۔''

''نہیں..........................''

''تو پھر میرے ناول میں کیا خرابی ہے۔؟''

''سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ ناول تم نے لکھا ہے۔ تم جو عالی شان کوٹھی میں رہتے ہو۔ ایئر کنڈیشنڈ کاروں میں گھومتے ہو اور روزانہ مرغن غذائیں استعمال کرتے ہو۔ تم کیا جانو کہ غریبی کیا چیز ہوتی ہے۔ کس طرح لوگ ایک وقت کے فاقے کرتے ہیں۔ تمہیں رونا آتا ہو گا۔ دوسرے پڑھنے وال تو ہنستے ہیں۔ یہ بھی کوئی تک ہے ایک طرف تو وہ فاقے کرتی ہے اور دوسری طرف ایک امیر زادے سے عشق فرماتی ہے۔ میاں صاحب جب پیٹ میں بھوک ہوتی ہے تو اس وقت عشق سجھائی نہیں دیتا' صرف روٹی یاد آتی ہے۔''

''تعجب ہے۔ لیکن ہماری فلموں میں تو ہیروئن کو کبھی روٹی کی یاد میں گیت گاتے ہوئے نہیں دکھایا جاتا۔ وہ تو ہمیشہ عشق عشق کرتی رہتی ہے۔ اگر وہ غریب ہے تو کوئی امیر لڑکا اس سے محبت کرے گا۔ اگر وہ امیر ہے تو کسی غریب لڑکے سے عشق کرے گی۔ فلموں میں بھی ہوتا ہے۔ ناولوں میں بھی یہی ہوتا ہے۔''

''میں پوچھتا ہوں۔ انسانی زندگی میں ایسا ہوتا ہے یا نہیں۔''

''ہوتا ہے۔''

جبار صدیقی نے اس کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔

''تم رئیس ابن رئیس ہو۔ کیا تم کسی غریب لڑکی سے محبت کر سکتے ہو۔ کیا تم اس سے شادی کر سکتے ہو۔؟''

''مم ، میں............'' وہ بوکھلا گیا۔

''کیوں ، زبان کیوں بند ہوگئی۔ بہانے بناؤ کہ تمہاری شادی ہوچکی ہے یا کسی رئیس زادی سے محبت ہو گئی ہے۔''

''ہاں ، ہاں یہی بات ہے آپ اسے بہانہ سمجھیں گے لیکن آج ہی میں نے شریک حیات کے لیے ایک لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔وہ کوئی بڑے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔''

''معلوم ہوتی ہے کا مطلب کیا ہوا۔یعنی تم اسے اچھی طرح نہیں جانتے ہواور اس سے عشق کر بیٹھے۔ایسا ہی الٹا سیدھا اپنے ناولوں میں پیش کرتے ہو۔خدا تم جیسے لکھنے والوں سے بچائے میں تو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ ناول لکھنے کے خیال سے باز آجاؤ۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔تم ایک بہت عالی شان ہوٹل کے مالک ہو، لذیذ کھانوں کے مینو لکھ سکتے ہو لیکن غریبوں کی زندگی پر ناول نہیں لکھ سکتے۔''

شہر یار نے صوفے کے ہتھے پر جوشیلے انداز میں ہاتھ مار کر کہا۔''میں لکھ سکتا ہوں''

''لکھنے کو تو سب ہی لکھ سکتے ہیں لیکن ناول تو ایسا ہونا چاہیے جسے باذوق قارئین پسند کریں۔''

''میں ایسا ہی ناول لکھوں گا۔''

''ایسا ناول تم فوم کے بستر پر لیٹ کر یا ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھ کر نہیں لکھ سکتے۔اس کے لیے تمہیں غریبوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنا ہوگا۔تم اس ماحول میں رہ کر ہی سمجھ سکتے ہو کہ زندگی میں کانٹے کس طرح چبھتے ہیں وہ اس طرح چبھتے ہیں کہ صرف پاؤں میں چھالے نہیں پڑتے۔دلوں میں بھی آبلے پڑ جاتے ہیں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں دیکھوں گا کہ کس طرح دل پر آبلے پڑتے ہیں۔میں اس ماحول میں ضرور جاؤں گا۔''

''صرف جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جب ان کی طرح مفلسی اور محتاجی کی زندگ گزارو گے تب ہی تمہیں حقیقت معلوم ہوگی۔تب ہی تم اپنے ناول میں پوری شدت سے یہ تاثر پیدا کرسکو گے کہ انسان کتنے کرب اور اذیتوں سے گزر کر زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں حاصل کرتا ہے۔

مگر شہر یار! یہ تمہارے لیے بہت مشکل ہے۔تم ننگے پاؤں چلو گے تو پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے۔

دو دن فاقے کرو گے تو بیمار پڑ جاؤ گے۔تم جیسے رئیس زادے نے کبھی بھوک اور بیماری نہیں دیکھی ہے۔

شہر یار نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''بس کیجیے جبار صاحب ! میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا۔ یہ باتیں آپ کے لیے ناممکن ہوسکتی ہیں لیکن میرے لیے دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔ میں ایسی زندگی گزار کر بتاؤں گا اور اس ماحول میں بیٹھ کر ناول لکھوں گا۔اب آپ جایئے۔ چھ ماہ کے بعد ہماری ملاقات ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔

جبار صدیقی نے فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔

''ارے ارے ،کہاں جا رہے ہو۔ پہلے میرے نقصان کا حساب تو کرو۔تم نے کہا تھا۔اگر ناول فروخت نہیں ہوگا تو تم میرا نقصان پورا کرو گے۔خدا گواہ ہے۔ مجھے پورے دو لاکھ روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔''

شہر یار نے جواب دیا۔

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے آپ جس شہر یار سے اپنا نقصان پورا کرنا چاہتے ہیں۔وہ رئیس زادہ مر چکا ہے۔آج سے اور ابھی سے میں ایک غریب اور قلاش آدمی ہوں۔ جو دو لاکھ تو کیا دس روپے بھی کسی کو نہیں دے سکتا۔

محترم جبار صدیقی صاحب ایک شاہکار ناول شائع کرنے کیلئے ضروری نہیں ہے کہ ایک مصنف ہی مصیبتیں اٹھائے کچھ مصیبتیں پبلشر کو بھی برداشت کرنی چاہیئں ۔لہذا چھ ماہ تک آپ بھی اللہ اللہ کیجیئے ۔خدا حافظ......''

وہ جواب سنے بغیر پلٹ گیا اور تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

جبار صدیقی اسے حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔وہ تو محض اسے سمجھانے آیا تھا کہ وہ غریبوں کی زندگی پر ناول نہیں لکھ سکے گا۔اس کے لیے مفلسی اور غربت کا ذاتی تجربہ ضروری ہے۔اسے کیا معلوم تھا کہ وہ سچ مچ تجربہ کرنے پر آمادہ ہو جائے گا اور اپنے ساتھ اسے بھی چھ ماہ کے لیے ڈبو دے گا۔وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر صوفہ پر گر پڑا۔

شہریار میز پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔اس کے سامنے ہوٹل کی آمدنی اوراخراجات کے فائل پڑے ہوئے تھے۔منیجر میز کے قریب اس انتظار میں کھڑا ہوا تھا کہ وہ جلد ہی فائلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے جانے کی اجازت دے گا۔لیکن شہریار اس وقت کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔

اس کے تصور میں غریبوں کی ایک نئی دنیا تخلیق ہو رہی تھی۔حالانکہ غریبوں کی دنیا کوئی نئی دنیا نہیں ہے۔یہ تو انسانی تہذیب کی طرح پرانی ہے اوراس کی خودغرضیوں کی طرح دائم وقائم ہے۔لیکن شہریار جیسے امیر زادے کے لیے نئی تھی۔اس نے کوٹھی کی بالکونی سے اورایئر کنڈیشنڈ کاروں کی کھڑکیوں سے جھانک کر غریبوں کو دیکھا تھا ان کے حال پر ترس بھی کھایا تھا ۔مگر ان کے ساتھ رہنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔اب تو ان کے ساتھ رہنا ہی نہیں بلکہ ان کی طرح زندگی گزارنے کی شرط گلے پڑ گئی تھی۔اسے ایک دو دن نہیں پورے چھ ماہ تک ایک غریب اور بے سہارا انسان بن کر زندگی کا تجربہ کرنا تھا اوراس کی زندگی پر ایک شاہکار ناول لکھ کر یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کے لیے کوئی کام ناممکن ہے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ چھ ماہ تک اس گھر سے دور رہنے کے لیے اپنی امی سے کیسے اجازت لی جائے۔وہ جانتا تھا کہ اس کی والدہ اسے محتاجی کی زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیں گی۔یہ تو کھلی نادانی تھی کہ دنیا جہاں کی نعمتوں کو ٹھکرا کر وہ ازسرنو مزدوروں اور محنت کشوں کی طرح نچلے طبقہ میں چلا جائے بلندی سے پستی کی طرف مائل ہونے والوں کو احمق یا پاگل ہی کہا جا سکتا ہے اوروہ اپنی ضد کی وجہ سے ایسی حماقت کرنے پر مجبور تھا۔منیجر نے اس کی طویل خاموشی سے اکتا کر کہا۔

''شہریار صاحب! حساب دیکھ لیجیے''

''آں...........''اس نے خیالات سے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔

''کیا کہا تم نے۔''

''جی وہ حساب چیک کر لیجیے۔ہوٹل کے لیے کچھ ضروری سامان بھی خریدنے کی ضرورت ہے وہ ہمارے سامنے والے ہوٹل کا باس جرمنی گیا تھا۔وہاں سے ایسا ککر خرید کر لایا ہے جس پر پانچ سو آدمیوں کا کھانا آدھے گھنٹے میں تیار ہو جاتا ہے۔اس کے مقابلہ میں ہمیں بھی جدید ککر اور پلیٹ واشنگ کی مشین منگوانی ہوگی۔''

شہریار نے ناگواری سے کہا۔

''تم کیا چاہتے ہو کہ میں یہ چیز خریدنے کے لیے جرمنی جاؤں اور وہاں مہینے دو مہینے ضائع......''

وہ کہتے کہتے رک گیا اور خوش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

منیجر نے کہا۔

''اعلیٰ کوالٹ کا انتخاب کرنے کے لیے تو جرمنی جانا ہی ہوگا' آپ چاہیں تو وہاں سے ایک مہینہ میں واپس آسکتے ہیں۔''

شہریار نے مسکرا کر پوچھا

''کیوں ایک ماہ کی بجائے چھ ماہ گزار کر نہیں آسکتا۔''

''چھ ماہ۔ ساری زندگی گزار سکتے ہیں۔اگر بیگم صاحبہ سے اجازت مل جائے۔''

''اجازت مل جائے گی۔امی تم سے پوچھیں گی تو کہہ دینا کہ شہریار صاحب جرمنی جائیں گے۔وہاں رہ کر اپنی آنکھوں کے سامنے مشینیں بنوائیں گے۔پھر انہیں یہاں لائیں گے۔اس کے لیے چھ ماہ کی ضرورت ہے۔''

''یعنی کہ مجھے بیگم صاحبہ سے جھوٹ کہنا ہوگا۔''

''اس میں حرج ہی کیا ہے۔ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر دن رات جھوٹ بولتے ہو۔کیا میری خاطر ایک جھوٹ نہیں بول سکتے۔''

''جی ہاں بول سکتا ہوں مگر آپ چھ ماہ تک لوٹ آئیں گے نا۔''

''ارے کون گدھا جرمنی جارہا ہے۔میں تو چھ ماہ تک اس گھر سے دور رہنا چاہتا ہوں۔''

''جی!'' اس نے حیرانی سے پوچھا ''آپ اتنے دنوں تک کہاں رہیں گے۔؟''

''میں کہیں بھی رہوں۔تم سے مطلب۔جو میں کہتا ہوں وہی کرتے جاؤ۔''

''جی بہت اچھا۔''

''جاؤامی کے پاس جا کرانہیں اچھی طرح سمجھاؤ کہ میرا جرمنی جانا کتنا ضروری ہے۔''

''جی ابھی جا کر سمجھاتا ہوں۔'' وہ کمرے سے باہر جانے لگا۔

''اور سنو......ان سے کہنا کہ میں آج ہی شام کو جا رہا ہوں۔''

''لیکن......اتنی جلدی آپ کیسے جا سکتے ہیں۔''

''میں جو کہتا ہوں وہی کرو۔''

''جی بہت اچھا۔'' وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

شہریار اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری کے پاس گیا اور وہاں سے سوٹ کیس اٹھا کر اس میں کپڑے رکھنے لگا۔ اس کے پاس ایک سے ایک قیمتی سوٹ، نکٹائیاں ،سینٹ اور شیونگ کی آٹو میٹک مشین وغیرہ تھیں' یہ چیزیں ساتھ رکھ کر وہ غریبوں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتا تھا لیکن والدہ کو دکھانے کے لیے سفر کا تمام سامان وہاں سے لے جانا ضروری تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنی والدہ کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''اس لڑکے نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔میں جب تک اس کے پیروں میں شادی کی زنجیر نہیں ڈالوں گی' یہ اسی طرح گھر سے بھاگتا رہے گا۔''

ان کی آواز قریب آتے آتے کمرے میں پہنچ گئی۔

''تم جرمنی کیوں جا رہے ہو منیجر کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔''

''امی ! منیجر کے پاس بین الاقوامی پاسپورٹ نہیں ہے۔میرا جانا بہت ضروری ہے ۔ہماری عزت کا سوال ہے۔اگر جلد از جلد نئی مشینیں نہیں آئیں گی تو تمام گاہک شہباز ہوٹل میں چلے جائیں گے پھر ہمارے

ہوٹل میں الو بولیں گے۔''

اس کی والدہ نے بے بسی سے اسے دیکھا اور کہا۔

''لیکن تمہیں اتنی جلدی پلین کا ٹکٹ کیسے ملے گا؟''

''چانس پر مل جاتا ہے۔نہیں ملے گا تو واپس آجاؤں گا مگر آج ضرور جاؤں گا ۔آپ جلدی سے دعائیں دیجیے۔''

''دعائیں کیا دوں۔تمہاری جدائی کے خیال سے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ادھر تمہاری آنٹی کا فون آیا ہے کہ تمہارے انکل سخت بیمار ہیں فوراً آؤ۔اب میں تمہارے جانے تک یہاں رہوں گی تو انہیں شکایت ہوگی کہ بیماری کی خبر سن کر بھی آنے میں دیر کر دی۔''

''آپ دیر نہ کریں امی ! انکل کی عیادت کے لیے ضرور جائیں۔میں کوئی پہلی بار تو ملک سے باہر نہیں جا رہا ہوں۔ ہر سال جاتا ہی رہتا ہوں۔ ہر سال آپ کا کلیجہ منہ کو نہیں آنا چاہیے۔''

''تم ماں کی ممتا کو کیا سمجھو گے۔اگر سمجھتے تو پلیٹ صاف کرنے کی مشین لانے کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جاتے۔میں پوچھتی ہوں کیا ہوٹل کے ملازم مر گئے ہیں۔وہ پلیٹیں کیوں نہیں صاف کرتے۔''

''امی ! سب نکمے اور کام چور ہیں۔ایک گھنٹہ کام کرتے ہیں اور چار گھنٹے آرام ... ایسے انسانوں سے مشینیں اچھی ہیں ایک منٹ میں درجنوں برتن صاف کر دیتی ہیں۔''

منیجر نے آگے بڑھ کر کہا۔

''بیگم صاحبہ ! وہاں جانے میں شہریار صاحب کا اور آپ کا فائدہ ہے۔وہاں انگریزوں کے ماحول میں جا کر اردو ناول لکھنے کی عادت ختم ہو جائے گی۔آپ بھی یہی چاہتی ہیں کہ یہ ناول لکھنے کی بیماری دور ہو جائے۔''

''ہوں!'' بیگم بشارت تائیدی انداز میں سر ہلا کر سوچنے لگیں۔اتنے میں ایک ملازم نے آ کر کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ کا فون ہے۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی جانے لگیں۔

''اچھا تو امی چاہتی ہیں کہ میں ناول لکھنا چھوڑ دوں۔''

''جی ہاں وہ ہمیشہ آپ کی بھلائی کے لیے سوچتی ہیں دیکھیے ناں! یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ ملازم پکاتے ہیں

اور مالک کھاتے ہیں۔اسی طرح غریب لکھتے ہیں اور امیر وقت گزارنے کے لیے پڑھتے ہیں۔''

اس نے جواب دیا۔

''آج سے میری زندگی کے اصول بدل جائیں گے۔ میں ایک ملازم کی طرح محنت کروں گا اور ایک غریب مصنف کی طرح زندگی کی زہریلی کہانی لکھوں گا۔''

''یہ ، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔خدا نہ کرے کہ آپ غریبوں کی طرح محنت مزدوری کریں آپ کے پاس تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔''

''سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا وہ کیسے زندگی گزارتے ہیں؟''

''اور کیسے گزارتے ہیں جناب ! تقدیر کے دھکے کھاتے رہتے ہیں۔کہیں آپ کا ارادہ بھی دھکے کھانے کا تو نہیں ہے۔''

شہریار نے جواب دینا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی بیگم بشارت آ گئیں۔ وہ اپنے موٹاپے کی وجہ سے ہانپتی ہوئی بولیں۔

''توبہ ہے ، یہ سڑھیاں چڑھتے اترتے میری سانس پھول جاتی ہے۔میں تو جا رہی ہوں۔آپا بہت پریشان ہیں بار بار فون کر رہی ہیں۔تمہارے ساتھ ایئر پورٹ جاؤں گی تو دیر ہو جائے گی۔اپنی ضرورت کی ہر چیز اچھی طرح یاد کر کے رکھ لینا۔ایسا نہ ہو وہاں کسی چیز کے محتاج بن کر رہ جاؤ۔''

''امی ! آپ کی دعایں ساتھ ہوں گی تو مجھے کسی چیز کی محتاجی نہیں ہوگی۔''

ماں نے دونوں ہاتھوں سے بیٹے کو چہرے کو تھام لیا اور ممتا بھرے لہجے میں بولیں۔

''میں تو ہر وقت دعا کرتی ہوں کہ تمہاری زندگی میں کوئی مصیبت کی گھڑی لکھی ہو تو وہ میرے نام ہو جائے۔جاؤ بیٹے ،اللہ کی رحمتوں کا سایہ ہمیشہ تم پر رہے گا۔''

یہ کہہ کر انہوں نے بیٹے کی پیشانی چوم لی اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا

''مجھے فوراً ہی تمہاری آنٹی کے پاس جانا ہے۔بولو جاؤں۔''

''آپ جائیے امی! انہیں آپ کی ضرورت ہے۔خدا حافظ''

''خدا حافظ''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے تک گئیں۔وہاں سے پلٹ کرانہوں نے بیٹے کو دیکھا ان کے ہونٹوں پر ممتا بھری مسکراہٹ آئی پھر وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔

وہ ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گیا اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر بولا۔

''ماں کتنی عظیم ہوتی ہے۔اولاد کے لیے ہنستی ہیں۔اولاد کے لیے روتی ہے اور میں ہوں کہ ماں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔خیر وہ تو جانا ہی ہوگا۔زندگی میں دکھ سکھ کا تجربہ نہ کیا تو پھر کیا کیا۔چھ ماہ کی تو بات ہے۔واپس آ کر پھر امی کی گود میں کھوئی ہوئی مسرتیں حاصل کرلوں گا۔

منیجر نے پوچھا۔

''جناب میرے لیے کیا حکم ہے۔؟''

شہر یار نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہ دونوں سوٹ کیس لے کر ہوٹل چلے جاؤ اور انہیں اپنے کمرے میں چھپا کر رکھ دو۔ہوٹل کے کسی ملازم کو پتہ نہ چلے کہ یہ میرا سامان ہے۔امی پوچھیں گی تو کہہ دینا کہ تم مجھے ایئر پورٹ تک رخصت کرنے گئے تھے۔''

''جی بہت اچھا۔'' وہ سوٹ کیس اٹھا کر جانے لگا۔

شہر یار سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ نئی زندگی کے سفر کے لیے کونسا سامان ساتھ رکھنا چاہیے۔اس کمرے میں جو بھی سامان تھا۔وہ اس کی امارت اور شان وشوکت کی چغلی کھاتا تھا۔حتی کہ کوئی پرانا لباس بھی نہیں تھا کہ جسے پہن کر وہ رئیسانہ زندگی کا چولا اتار دیتا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر الماری کے پاس آیا۔اسکے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔

ناول لکھنے کے لیے سب سے پہلے کاغذ اور قلم کی ضرورت تھی اس کے پاس جو قلم تھا ، وہ بہت قیمتی تھا۔کم قیمت کی کوئی چیز تھی ہی نہیں وہ بے چارہ کیا کرتا۔آخر اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے کچھ لے جانے کی بجائے

کچھ روپے ساتھ لے جائے تاکہ بازار سے ضرورت کی سستی چیزیں خرید سکے۔

یوں بھی زندگی گزارنے اور رہنے سہنے کا جب تک کوئی ٹھکانہ نہ بنتا اس وقت تک کچھ رقم کی ضرورت پیش آتی۔ اب ایسا تو نہیں تھا کہ گھر سے نکلتے ہی فاقے شروع کر دیتا۔ یہ تو سراسر حماقت ہوتی۔

اس نے دوسری دراز کو کھولا۔ اس میں مختلف بینکوں کی چیک بکس اور پانچ لاکھ روپے نقد رکھ ہوئے تھے۔ اسے کچھ دنوں کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور کم سے کم پیسوں کی ضرورت تھی ۔اس نے ہزار کے پچاس نوٹ یعنی پچاس ہزار روپے اٹھا لیے۔ ایک رئیس زادے کے لیے یہ رقم بہت تھوڑی سی تھی۔

روپے جیب میں ٹھونسنے کے بعد اس نے تھیلے کو واپس رکھ دیا اور الماری کو لاک کرنے لگا۔

اسی وقت ایک ملازم نے آ کر کہا۔

''صاحب ! مجھے سو روپے کی ضرورت ہے۔ بیگم صاحبہ چلی گئی ہیں نہیں تو میں ان سے مانگ لیتا۔''

شہر یار نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

''پرسوں تم نے تنخواہ لی ہے۔ آج پیسے مانگنے آ گئے ہو۔ کیا کرو گے سو روپے۔''

وہ سر جھکا کر جواب دینے سے ہچکچانے لگا بلکہ شرمانے لگا۔

''ارے بولتے کیوں نہیں۔''

''وہ صاحب جی ! چنبیلی ضد کرتی ہے کہتی ہے فلم دیکھے گی۔'' شہر یار اسے سر سے پیر تک دیکھنے لگا۔ وہ ایک پرانی پتلون اور بشرٹ پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں اسفنج کی چپل تھی اور انگلی میں چاندی کا ایک چھلا۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم چنبیلی سے شادی کب کر رہے ہو۔''

''کیا بتاؤں صاحب جی ! آج کل کی عورتیں شادی سے پہلے لکھا پڑھ کرتی ہیں کہ مہینے میں دس فلمیں دکھانی ہوں گی۔ ابھی وہ لڑائی لے رہی ہے کہ میں شادی کے بعد فرمانبردار شوہر بن سکتا ہوں یا نہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں امتحان میں پاس ہو جاؤں گا۔''

شہر یار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم یہ پرانا لباس پہن کر چنبیلی کے ساتھ سینما جاؤ گے تو وہ کیا سوچے گی۔ تمہیں تو ایسا لباس پہننا چاہیے جیسا میں نے پہنا ہے۔''

''صاحب جی! ہماری قسمت میں ایسا لباس کہاں ہے۔''

''تمہاری قسمت بدل سکتی ہے۔ دیکھو ہم دونوں جسامت میں ایک ہیں میرا لباس تمہارے بدن پر آ سکتا ہے۔''

''ہی ہی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اور آپ کا لباس پہنوں ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

''سب کچھ ہوسکتا ہے۔'' شہریار نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے باتھ روم کی طرف کھینچ کر لے جانے لگا۔

''یہ ، یہ کیا کر رہے ہیں صاحب جی۔''

''میں تمہیں چنبیلی بیگم کا ہیرو بنا رہا ہوں۔ میرا لباس تم پہنو گے اور تمہارا لباس میں پہنوں گا۔ خبردار! یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ زبان بند رکھو گے تو تمہیں سو کی بجائے ہزار روپے دوں گا۔''

وہ ملازم کو کھینچتا ہوا باتھ روم میں گیا پھر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد باتھ روم کا دروازہ کھل گیا۔ وہ دونوں کمرے میں آ گئے۔ شہریار ملازم کے لباس میں اور ملازم اس کے لباس میں نظر آ رہا تھا۔ ملازم نے اپنا حلیہ آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہی ہی صاحب جی! اچھا کپڑا آدمی کو آدمی بنا دیتا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے لباس میں آدمی نظر نہیں آ رہا ہوں۔''

وہ گھبرا کر بولا ۔

''جی نہیں جی ہاں آپ بھی آدمی ہیں بلکہ فرشتہ ہیں۔ صاحب جی! لعل گدڑی میں رہ کر بھی لعل ہی نظر آتا ہے۔''

''اوہ ، یہی تو میں نہیں چاہتا میں تمہاری طرح چہرے سے بھی غریب نظر آنا چاہتا ہوں۔''

''صاحب! یہ جو دکھوں بھری زندگی ہوتی ہے نا وہی غریب کا چہرہ بگاڑتی ہے ۔ان پرانے کپڑوں سے

آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو ۔یہ لو روپے۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹوں میں سے ایک نوٹ نکال کر اسے دیا اور باقی نوٹوں کو پتلون کی جیب میں رکھنے لگا۔

''ارے یہ جیب تو پھٹی ہوئی ہے۔''

ملازم نے سر ہلا کر کہا۔''جی ہاں دوسری جیب بھی پھٹی ہوئی ہے۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔''تم عجیب آدمی ہو۔تم ایسے کپڑے کیوں پہنتے ہو جس میں جیب نہیں ہوتی۔''

''صاحب جی! غریب کے پاس جیب ہوتی تو پھر وہ غریب نہ ہوتا۔''

شہر یار نے چونک کر کہا۔''واہ ،واہ کتنی گہری بات کہی ہے۔یہ تو ناول میں لکھنے والی بات ہے۔یہ کپڑے پہنتے ہی مجھے غریبوں کی زندگی کا تجربہ ہونے لگا ہے۔کہاں ہے میرا قلم میں یہ باتیں نوٹ کروں گا۔''

وہ الماری کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر اس کے قدم رک گئے۔

دل نے کہا۔'جب تم غریب بن چکے ہو تو ایک امیر زادے کے مہنگے قلم کا سہارا کیوں لیتے ہو۔ آج سے اور ابھی سے یہاں کی ہر چیز پرائی ہو چکی ہے۔باہر جاؤ اور اپنی محنت کی کمائی سے ایک قلم خرید کر زندگی کے ان چیختے ہوئے تجربات کو محفوظ کر لو۔'

اس کا سر جھک گیا۔اس نے شکست خوردہ نظروں سے ملازم کو دیکھا' آہستہ آہستہ کمرے سے باہر جانے لگا۔

☆☆☆☆

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

وہ کاندھے سے کپڑے کا ایک معمولی سا جھولا لٹکائے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ اسکے چہرے پر تھکن کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کے بوجھل قدموں سے یوں لگتا تھا۔ جیسے وہ کئی میل کی مسافت طے کر کے آ رہا ہو۔

اس کے تھیلے میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ وہ کسی شاندار ہوٹل کا کمرہ کرائے پر لے کر آرام سے یہ رات گزار سکتا تھا لیکن وہ غریبوں کے کسی محلے میں رہنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ ایک محلّہ کا پھیرا لگا چکا تھا۔ وہاں ایک تنہا نوجوان کو کسی نے بھی کرائے پر کمرہ نہیں دیا۔ ایک جگہ اسے رہنے کی اجازت ملی۔ مگر وہاں آس پاس اتنی بھینسیں بندھی ہوئی تھیں کہ گوبر کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں کولر کے ذریعے چنبیلی کی خوشبو چھڑک کر سونے کا عادی تھا' اس لیے اس بدبو کو برداشت نہ کر سکا۔ البتہ اس نے اپنے خریدے ہوئے قلم سے یادداشت کے طور پر یہ لکھ لیا کہ کچھ لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح غلاظت اور بدبو میں رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔

وہاں سے ناکام ہو کر وہ فٹ پاتھ پر بھٹکنے لگا اور رات گزارنے کے لیے کوئی مناسب سی جگہ تلاش کرنے لگا ۔لیکن فٹ پاتھ پر اس کے معیار کی جگہ نہیں تھی' تھک ہار کر وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کسی چھوٹے سے ہوٹل کا چھوٹا سا کمرہ لے کر رات گزار دے۔

وہ جہاں کھڑا تھا۔ وہاں قریب ہی ایک چھوٹا سا اوسط درجہ کا ہوٹل تھا۔ لوگ میز کرسیوں پر بیٹھے اپنی پسند کے کھانے کھا رہے تھے۔ اس سے ذرا دور فٹ پاتھ پر نچلے درجہ کی ایک دکان تھی۔ جہاں ترازو سے تول کر سڑک چھاپ پلاؤ فروخت ہو رہا تھا۔ انتہائی غریب قسم کے لوگ اکڑوں بیٹھے ہوئے پلاؤ کھانے کی حسرت پوری کر رہے تھے۔

اسے بھی بھوک کا احساس ہوا۔

وہ فیصلہ کرنے لگا کہ کہاں بیٹھ کر کھانا چاہیے۔فٹ پاتھ پر یا ہوٹل کی کرسی پر۔

ایک جگہ دس روپے میں پیٹ بھر جاتا ہے۔ دوسری جگہ تیس روپے خرچ ہوتے ہیں۔ تھیلے میں بڑے بڑے نوٹ ہوں تو تیس روپے کی رقم حقیر سی معلوم ہوتی ہے ۔اس وقت شہر یار نے سوچا کہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کھانا غریبی یا کفایت شعاری نہیں ہے ۔ بلکہ کنجوسی ہے۔فٹ پاتھ اور ہوٹل کے بھاؤ میں زیادہ سے زیادہ دس روپے کا فرق ہے۔ یہ دس روپے خرچ کر کے نہ کوئی غریب بن سکتا اور نہ دس روپے بچا کر امیر بن سکتا ہے۔

وہ بہت دیر تک وہاں کھڑا اپنے آپ کو قائل کرتا رہا کہ غریب ہونے کے باوجود میں انسان ہوں مجھے فٹ پاتھ پر جانوروں کی طرح جگالی نہیں کرنا چاہیے ۔ یہ لوگ جو اکڑوں بیٹھے کھا رہے ہیں محض پیسوں کی بچت کر رہے ہیں یا پھر اپنی عادت سے مجبور ہیں۔

وہ میز کرسیوں والے ہوٹل کی جانب بڑھنے لگا پھر چند قدم چلنے کے بعد رک گیا۔اس کے سامنے سڑک کے دوسر طرف ایک سینما ہال تھا۔ رات کا آخری شو ختم ہو چکا تھا ۔لوگ ہال سے باہر آ رہے تھے۔ٹانگے ،رکشے اور ٹیکسیوں کی بھیڑ لگی تھی ۔اسی بھیڑ میں ایک نوجوان عورت کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے تھے۔

اس عورت کے سیاہ بالوں میں ایک پھول کھل رہا تھا۔اس پھول کو دیکھتے ہی وہ عورت کالج کے گیٹ کے سامنے کھڑی ہوئی ریشم نظر آنے لگی۔

ریشم ....!

وہ اس نام کو اور اس نام والی کے حسین چہرے کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔جس طرح چاند صرف رات کی زلفوں میں کھلتا ہے ،اسی طرح پھول صرف ریشم کی زلفوں میں سجتا تھا۔اس لیے پھول کو دیکھ کر سینما ہال کے سامنے کھڑی ہوئی وہ عورت ریشم کے روپ میں نظر آنے لگی۔

اس عورت کا ساتھی کبھی رکشہ اور کبھی کسی ٹیکسی والے سے کہیں چلنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن کوئی راضی نہیں ہو رہا تھا۔شہر یار دور فٹ پاتھ پر کھڑا پھول والی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سڑک پار کر کے اس کے قریب پہنچ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور وہ اس عورت کے قریب سے دیکھ کر ریشم کے حسین تصور کو ٹھیس نہیں پہنچانا

چاہتا تھا۔ دل کی تسلی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ریشم معلوم ہو رہی تھی۔

وہ اپنے ساتھی کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگی۔ انہیں کوئی سواری نہیں ملی تھی اس لیے وہ مجبور ہو کر آہستہ آہستہ پیدل چل رہے تھے۔ شہر یار بھی آہستہ آہستہ یوں چلنے لگا جیسے وہ پھول ایک مقناطیس ہو ، جس کی کشش سے وہ کھنچا جا رہا ہو۔

اے میرے پھول! ہم ندی کے دوسرے کنارے پر ہیں۔ تم اس فٹ پاتھ پر ہو۔ میں اس فٹ پاتھ پر تنہا بھٹک رہا ہوں اور اس گھڑی کے انتظار میں ہوں ، جب ریشم تمہیں اپنی زلفوں سے اٹھا کر محبت سے مجھے پیش کرے گی۔

میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور وقت سے پہلے اپنی کامیابی کا یقین کر رہا ہوں۔

یہ میری خوش فہمی ہے لیکن بعض اوقات انسان کی خوش فہمی اسے منزل مراد تک پہنچا دیتی ہے۔

کل صبح میں کالج کے گیٹ کے سامنے جاؤں گا اور اسے ایک نظر دیکھوں گا' ہو سکا تو اس کا پتا حاصل کروں گا۔ حالانکہ میں ایک غریب کی طرح زندگی گزارنے نکلا ہوں لیکن غریب بھی تو محبت کرتے ہوں گے۔ ان کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔ وہ ضرور محبت کرتے ہوں گے۔ میں بھی اس کی تمنا کروں گا۔ ویسے ریشم کوئی رئیس زادی ہے۔ میری غربت کو دیکھ کر نہ جانے میرے متعلق کیا رائے قائم کرے گی۔

آہ! اب تو امیری اور غریبی کا مسئلہ آن پڑا ہے۔ وہ کسی فلم کا گیت ہے کہ چاندی کی دیوار نہ توڑی، پیار بھرا دل توڑ دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ریشم مجھے غریب سمجھ کر دل توڑ دے' لیکن وہ تو مجھے ایک رئیس زادے کے روپ میں دیکھ چکی ہے۔ میں اس سے اپنی اصلیت نہیں چھپا سکتا۔

''کیوں نہیں چھپا سکتے۔'' اس کے دل نے کہا۔ 'چھ ماہ کے دوران تم خود کو ایک رئیس باپ کا بیٹا نہیں کہہ سکتے۔ اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد اور اس کی آمدنی سے ایک پیسہ نہیں لے سکتے۔ اگر لینا چاہتے ہو یا ریشم کو اپنی اصلیت بتانا چاہتے ہو تو اپنی ضد سے باز آ جاؤ ۔ واپس گھر لوٹ جاؤ۔ ایک غریب کی طرح زندگی گزارتے ہوئے کسی لڑکی سے محبت کرنا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔'

اس نے جوشیلے انداز میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے ضدی دماغ نے کہا۔

''میں ایسی زندگی گزار سکتا ہوں۔ چھ ماہ کی غربت اور مجبوریاں دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جائیں گی۔اس دوران اگر ریشم سے سامنا ہوا تو میں کہہ دوں گا کہ میں رئیس زادہ نہیں ہوں۔اس نے آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے وہ محض ایک فریب تھا۔'' ایک لڑکی سے بولنے کے لیے کئی طرح کی باتیں بنائی جا سکتی ہیں۔

اس کے ذہن میں کئی طرح کی باتیں آ رہی تھیں۔وہ سوچتا ہوا فٹ پاتھ پر چل رہا تھا لیکن اس کی نظریں دوسرے فٹ پاتھ پر چلنے والے پھول پر جمی ہوئی تھیں۔چاندنی رات مس وہ پھول دور سے ایک نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔اس چمک کے پیچھے وہ جانے کتنی دور چلا آیا تھا۔

پھر انہیں ٹیکسی مل گئی۔اس عورت کے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی پھول نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ٹیکسی آگے بڑھ گئی اور شہریار کے قدم رک گئے۔

اب اس کے آس پاس خالی سڑکیں ،شکستہ فٹ پاتھ ، بند دکانیں اور اونگھتا ہوا شہر تھا۔

وہ جو ایک پھول تھا ،وہ آدھی رات کے سینے میں ایک جگنو کی طرح جل کر بجھ گیا تھا اور ایک ٹوٹے ہوئے خواب کی طرح شہریار کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

''یہ دیوانگی ہے۔'' اس نے سوچا۔'اس وقت مجھے پھول کی نہیں ،ایک بستر کی ضرورت ہے۔مجھے رات گزارنے کا بندوبست کرنا چاہیے یہاں دور دور تک ہوٹل نظر نہیں آ رہا ہے۔ویسے اسٹیشن قریب ہے' کیوں نہ وہاں کے ویٹنگ روم میں رات گزاری جائے۔

وہ اسٹیشن کی طرف جانے لگا۔

کچھ دور آگے جانے کے بعد فٹ پاتھ کے کنارے ایک کار کھڑی ہوئی نظر آئی۔رات کالی تھی ،کار بھی کالی تھی ۔اس لیے دور سے نظر نہیں آئی۔قریب پہنچ کر اسے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ آ گئی۔اسے اپنی ایئر کنڈیشنڈ مرسڈیز یاد آ گئی تھی اور اس طرح پیدل چلنے کی حماقت پر اسے مسکرانا آ گیا تھا۔جب اس کے جسم پر عمدہ تراش کا سوٹ ہوتا تھا۔دائیں ہاتھ کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگاتی رہتی تھی اور بائیں ہاتھ کی کلائی میں سونے کی چین سے بندھی ہوئی گھڑی اپنی چھب دکھایا کرتی تھی۔اس وقت کسی بھی راہ چلتی کار سے اسے لفٹ مل جایا کرتی تھی۔اپنے سامنے ایک کار کو دیکھ کر وہ ذرا دیر کے لیے اپنی موجودہ پوزیشن

کو بھول گیا اور لفٹ مانگنے کے لیے قریب چلا گیا۔

تیزی سے چلتے ہوئے اور ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ کچھ آگے بڑھا تو ایک اندھی گلی سے اچانک ہی دو سپاہی نکل کر اس کے سامنے آ گئے۔ ایک نے اسے للکار کر کہا۔

''کیوں بے! وہاں کار کے پاس کیا کر رہا تھا۔''

شہریار ایسے لہجے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔

''سپاہی جی! ذرا بندہ پہچان کر باتیں کرو۔ میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں۔''

ایک سپاہی نے قہقہہ لگا کر اپنے ساتھی سے کہا۔ ''سن اے شیر علی! لنڈے بازار کے کپڑے اور پھٹی پرانی چپل پہن کر شریف آدمی بن رہا ہے۔ ابھی حوالات میں لے جا کر بند کر دو تو ساری شرافت دھل کر رہ جائے گی۔''

شیر علی نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کیوں بے! اتنی رات کو کس کے گھر ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہے۔''

شہریار نے کہا۔

''بڑے افسوس کی بات ہے۔ ایک شریف راہگیر کو مجرم سمجھ رہے ہو اور وہ جو کار میں بیٹھے ہوئے ہیں، انہیں کچھ نہیں کہتے۔''

ایک سپاہی نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''بیٹے! اس کار والے نے صبح چار بجے تک سڑک کے اس حصہ کا کرایہ دیا ہے۔ وہ تمہاری طرح پھکڑ نہیں ہے۔ سیدھی طرح یہ بتا دو کہ کہاں سے لمبا ہاتھ مار کر آ رہے ہو۔ تمہارا یہ جھولا تو کچھ وزنی معلوم ہو رہا ہے۔''

شہریار نے پریشان ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنے تھیلے کو دبوچ لیا اور جلدی سے بولا۔ ''اس میں میرے کپڑے ہیں۔''

''لاؤ ہمیں دیکھنے دو۔''

''نہیں!'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

سپاہی شیر علی نے سر ہلا کر اپنے ساتھی سے کہا۔

''دین محمد ! معلوم ہوتا ہے تھیلے میں کچھ مال مسالہ ہے اسے تھانے لے چلو۔''

''تھانے............'' شہریار گھبرا کر انہیں دیکھنے لگا۔اس وقت وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔اگر انہیں تھیلے کی تلاشی لینے کی اجازت دیتا تو اس میں رکھے ہوئے روپے برآمد ہو جاتے اور انہیں سمجھانا دشوار ہو جاتا کہ اتنی رات کو اتنی بڑی رقم لے کر وہ سڑکوں پر آوارہ کیوں گھوم رہا ہے۔اگر وہ ان کے ساتھ تھانے جاتا تو خود کو ایک شریف شہری ثابت کرنے کے لیے اپنی اصلیت بتانی پڑتی پھر اس کی کوٹھی میں فون کیا جاتا' اس کی امی گھبرائی ہوئی تھانے پہنچتیں اور یہ دیکھ کر ان کا دل ٹوٹ جاتا کہ بیٹا چھ ماہ تک آوارگی کرنے کے لیے جھوٹ بول کر گھر سے نکلا تھا۔

سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی بات تھی۔گھر سے نکلتے ہی ایسے مصیبت نازل ہو رہی تھی کہ نصف سالہ منصوبہ ناکام ہوتا نظر آ رہا تھا۔

دونوں سپاہیوں نے دونوں طرف سے اس کے بازوؤں کو تھام لیا تھا اور کشاں کشاں تھانے کی طرف لے جا رہے تھے اس نے گھبرا کر کہا۔

''مم ،میری بات تو سنو''

''تھانے چل کر سنانا''

''میرے پاس کچھ روپے ہیں''

دونوں سپاہی رک گئے اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے ۔شہریار نے کہا

''میں قادر آباد سے یہاں کوئی کاروبار کرنے آیا ہوں۔میرے پاس پچاس ہزار روپے تھے۔جس میں سے کچھ روپے خرچ ہو گئے۔میں ہوٹل میں رہ کر اور زیادہ پیسے خرچ نہیں کرنا چاہتا ہوں اس لیے اسٹیشن کی سرائے میں رات گزارنے جا رہا ہوں۔خدا کے لیے مجھ جیسے پردیسی کو اس طرح پریشان نہ کرو۔''

سپاہی دین محمد نے کہا۔''بے چارہ پردیسی ہے۔''

دوسرے نے کہا''ہاں ،ہمیں پریشان نہیں کرنا چاہیے۔چلو ہمیں ہزار روپے دے دو۔ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔''

''ہزار روپے............'' شہریار نے کہا

''ہاں تم ہمارے علاقے سے گزر رہے ہو۔ ہم آوارہ گردی کے الزام میں تمہیں گرفتار کر کے لے جائیں گے تو تھانے دار نیند سے اٹھ کر جھلائے گا اور تم سے ہزار کے بدلے دس ہزار وصول کرے گا۔ ہم تو تمہیں نقصان سے بچانا چاہتے ہیں۔''

بات ٹھیک ہی تھی۔ وہ خود نہیں چاہتا تھا کہ تھانے تک جانے کی نوبت آئے۔ یہاں سے ہزار روپے میں جان چھوٹ رہی تھی۔ اس نے چپکے سے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ سے نوٹ اچک کر کہا۔

''شاباش! سمجھدار آدمی ہو۔ اب جا سکتے ہو۔'' دوسرے نے ہمدردی سے کہا۔

''یار ...! اسے اسٹیشن کا دوسرا راستہ بتا دو۔ اگر یہ سیدھے راستے سے جائے گا تو اگلے موڑ پر دوسرے سپاہی اسے پریشان کریں گے۔''

''ہاں بھائی پردیسی ! کیا تم اس شہر میں پہلے بھی آئے ہو۔؟''

نہیں ....''

''پھر تو تم اس گلی سے اگلے راستے پر پہنچ جاؤ۔ اس راستے پر کوئی سپاہی نہیں ملے گا۔''

شہریار نے گہری سانس لے کر دل ہی دل میں کہا۔ یہ کیسی نگری ہے یہاں چوروں سے نہیں، سپاہیوں سے لٹنے کا خطرہ رہتا ہے اور ان سے بچ کر چلنے کے لیے سیدھا راستہ چھوڑ کر تنگ و تاریک گلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

وہ پاس والی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں اندھیرا تھا لیکن وہ جانے پہچانے راستے سے گزر سکتا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ایک سپاہی نے دوسرے سپاہی سے کہا۔

''جاؤ ،نورے کو خبر کر دو کہ لال گودام کی گلی سے ایک شکار گزر رہا ہے ہمارا کمیشن دس ہزار سے کم نہیں ہو گا۔ جاؤ یہ کام فٹافٹ ہونا چاہیے۔''

دوسرا سپاہی تیزی سے چلتا ہوا اور تقریباً دوڑتا ہوا اس گلی کی طرف چلا گیا۔ جس طرف وہ کالے رنگ کی

کار کھڑی ہوئی تھی۔ جب اس کے قدموں کی دھمک دور ہوتے ہوتے اندھیرے میں ڈوب گئی تو رات کے سینے پر گہرا سناٹا چھا گیا۔

شہر یار سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اندھیری گلی سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں کس مکان کی کھڑکی سے آنے والی روشنی اس گلی کو روشن کرتی تھی پھر آگے چل کر وہی تاریکی چھا جاتی تھی۔ آگے وہ گلی دو راستوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک راستہ لال گودام کی گلی کی طرف جاتا تھا۔ اس گلی کے اختتام پر سامنے ہی اومنی بسوں کا اڈہ تھا اور اس کے بعد چند قدم کے فاصلے پر اسٹیشن آ جاتا تھا۔

وہ لال گودام کی طرف جانے لگا کیونکہ وہی راستہ آسان اور سپاہیوں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ تھا۔

چلتے چلتے وہ سوچ رہا تھا کہ کسی ہوٹل میں رات نہ گزار کر اس نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔ جب تک اس کے تھیلے میں ایک بڑی رقم موجود ہے، وہ خود کو غریب کہہ سکتا ہے ، نہ لٹیروں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بھی پوچھ گچھ ہو سکتی ہے ۔کوئی جان پہچان کا آدمی ہی مل سکتا ہے ۔کوئی نہ کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے ۔لہذا بہتر یہی ہے کہ اسٹیشن کے قریب کسی ہوٹل میں ٹھہرا جائے۔

ایک خیال رہ رہ کر اسے پریشان کر رہا تھا کہ آخری اتنی مصیبتیں اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے

کیا وہ اپنی کوٹھی میں رہ کر غریبوں کی زندگی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا تھا۔

ذاتی تجربے کے لیے غریبوں کے کسی محلے میں ایک مکان حاصل کر لیتا۔ کبھی اس مکان میں رہتا اور کبھی کوٹھی میں آ کر ان کی زندگی پر ایک ناول لکھتا ۔مگر ایک ہی دن کے تجربہ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی پر جو بھی ناول لکھا جائے گا وہ بالکل روکھا پھیکا سا ہو گا ۔جہاں رومانس نہ ہو ہنسی کھلکھلاتی دوشیزاؤں کی ادائیں نہ ہوں جہاں صرف فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کھانے والے اور سڑکوں پر لوٹنے والے ملتے ہوں ۔بھلا اس ماحول پر کیا لکھا جا سکتا ہے۔

اس کے دل مں یہ بات گھر کرنے لگی کہ اس سے بہت بڑی حماقت سرزد ہو رہی ہے ۔اب بھی وہ اس حماقت سے باز آ سکتا ہے وہ ایک دن اپنے ہوٹل میں قیام کرے گا ۔دوسرے دن اپنی امی کے پاس واپس چلا جائے گا اور ان سے کہہ دے گا کہ اس نے سفر کے دوران جرمنی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اس لیے واپس چلا

آیا ہے ۔سیدھی سادی ماں کو باتوں سے بہلا دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے ۔رہ گیا پبلشر کا چیلنج ۔تو اس کے لیے ایک ناول لکھنا مشکل نہیں ہے ۔وہ اپنے گھر میں رہ کر ماں کی محبت غریبوں کے محلے میں رہ کر ان کی زندگی اور اس پھول والی آہ! پھول والی پھر یاد آ گئی کو ملا جلا کر زندگی کے ہر شعبہ کو اور انسان کے ہر جذبہ کو کاک ٹیل کی صورت میں ڈھال کر ایک دلچسپ ناول لکھے گا۔

وہ پبلشر کے چیلنج کو قبول کر رہا تھا مگر دوسرے انداز میں یعنی مقصد وہی تھا۔صرف راستہ بدل گیا تھا ۔اندھیری گلی میں چلتے چلتے دماغ روشن ہو گیا تھا ۔پھر اچانک ہی کسی نے اس کے سر پر ایسی بھرپور ضرب لگائی کہ وہ اندھیرا بھی روشن ہو گیا ۔آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے ۔وہ بوکھلا کر پلٹا تو دوسری طرف سے پھر کسی نے سر پر جیسے ہتھوڑا مار دیا ہو ۔وہ چکرا کر گر پڑا ۔ایسا گرا کہ پھر اٹھنے کی سکت نہ رہی۔

ماں کی آغوش میں پہنچنے والا گہری تاریکی کی آغوش میں ڈوبتا چلا گیا۔



اسے رفتہ رفتہ ہوش آنے لگا ۔اس کی آنکھیں بند تھیں۔لیکن کان آوازوں کو سن رہے تھے۔ پہلے پہل وہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ معلوم ہو رہی تھی۔پھر واضح طور سے باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔

ایک مترنم آواز کہہ رہی تھی۔

''ڈاکٹر! یہ ہوش میں آ رہا ہے''

کسی نے قریب آ کر اس کی کلائی تھام لی اور نبض کی رفتار دیکھنے لگا۔

شہر یار کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔اس کی نتھنوں میں دواؤں کی بو آ رہی تھی اور ایک آرام دہ بستر یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ وہ کسی ہسپتال کے بیڈ پر ہے لیکن اس کا دماغ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ وہ کسی ہسپتال کے متعلق نہ سوچ سکا ۔اسے اپنے گھر کی بھی یاد نہیں آئی وہ ذہن پر زور ڈال کر یہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کب نیند آئی تھی۔ وہ کہاں سو گیا تھا۔اور کہاں اس کی آنکھ کھل رہی ہے ۔وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے لگا۔

سب سے پہلے اسے ایک ڈاکٹر ایک نرس اور ایک وارڈ بوائے نظر آیا ۔ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ تو تھپک کر کہا۔

''ڈونٹ وری۔تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گے۔ابھی اٹھنے کی کوشش نہ کرنا ۔تمہارے سر پر گہرے زخم آئے ہیں۔''

وہ اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر سر کو ٹٹولنے لگا ۔وہاں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں ۔اس نے بڑی نقاہت سے کہا۔

''میں ،کہاں ہوں۔''

''تم ہسپتال میں ہو۔ابھی اپنے متعلق کچھ نہ سوچو۔کوئی فکر نہ کرو فی الحال تمہیں خاموش اور پر سکون رہنا چاہیے۔''

اتنے میں ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی وہاں آ گئے انسپکٹر نے پوچھا۔

''ڈاکٹر! یہ ہوش میں آ گیا ہے ۔کیا میں اس کا بیان لے سکتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے قریب آ کر ہولے سے کہا۔

''آپ شام کو کسی وقت بیان لیں تو مناسب ہوگا۔ابھی اس کی حالت نازک ہے ۔سر میں دو جگہ ٹانکے لگے ہیں ۔باتیں کرنے یا ذرا حرکت کرنے سے ٹانکے ٹوٹنے کا خدشہ ہے۔'' وہ انسپکٹر سے باتیں کرتا ہوا وارڈ سے باہر چلا گیا۔

شہر یار کی آنکھیں نقاہت کی وجہ سے بند ہونے لگیں۔تھوڑی دیر تک نرس کی مترنم آواز اس کی سماعت میں گھلتی رہی پھر وہ غفلت کے اندھیرے میں بھٹکنے لگا۔

وہ بند آنکھوں کی تاریکی میں عجب اوٹ پٹانگ قسم کے مناظر دیکھ رہا تھا۔کئی بار نرس کے چہرے بدل گئے ۔لیکن اس کی مسکراہٹیں ایک جیسی ہیں ۔وہ دوائیں پلاتی تھیں ،انجکشن لگاتی تھیں کبھی کچھ کھلاتی پلاتی بھی تھیں۔نہ جانے یہ سلسلہ کتنی دیر یا کتنے دنوں تک جاری رہا ۔پھر رفتہ رفتہ اس کی کھوئی ہوئی قوت بحال ہونے لگی ۔اب اس پر بار بار غنودگی طاری نہیں ہوتی تھی۔سر کے زخم سے بھی پہلے جیسی ٹیسیں نہیں اٹھتی تھیں اور وہ سرہانے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھنے لگا تھا۔

وارڈ میں اور بھی مریض تھے جن کے دوست احباب اور رشتے دار اکثر ان کی عیادت کے لیے آتے تھے لیکن اس کی عیادت کے لیے کوئی نہیں آتا تھا ۔وہ اپنی تنہائی کے متعلق سوچتا تھا اور پریشان ہو کر سر کو تھام لیتا تھا۔

پہلی بار جب وہ ذرا صحت یاب ہو کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا تو پولیس انسپکٹر نے آ کر کہا۔

''خدا کا شکر ہے۔آج میں تمہارا بیان لے سکوں گا۔پورے پانچ دنوں سے یہاں کے چکر لگا رہا ہوں لیکن تم نے غنودگی کے عالم میں میرے سوال کا کبھی صحیح جواب نہیں دیا ۔آج مجھے یقین ہے کہ تم پورے ہوش و حواس میں رہ کر جواب دو گے۔''

''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔'' شہریار نے پوچھا۔

انسپکٹر نے کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں رہتے ہو۔؟''

وہ آنکھیں سکیڑ کر سوچنے لگا پھر پریشان سا ہو کر بولا۔

''میں نے کئی بار سوچا ہے۔کئی بار اپنے آپ سے یہ سوال کیا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔''

نرس اور ڈاکٹر چونک کر اس کے قریب آ گئے۔ڈاکٹر نے مضطرب ہو کر پوچھا

''کیا ،کہا تمہیں اپنا نام یاد نہیں ہے۔''

''نہیں..................''

انسپکٹر نے پوچھا۔

''تم یہ بتا سکتے ہو کہ تم پر کس نے حملہ کیا تھا۔''

''مجھ پر......؟''شہریار نے پوچھا۔''کیا مجھ پر کسی نے حملہ کیا تھا۔''

انسپکٹر نے جھلا کر کہا۔''تم عجیب آدمی ہو۔کیا ہم سے کچھ چھپانا چاہتے ہو۔یا ان مجرموں کا نام لینے سے ڈرتے ہو۔''

شہریار نے معصومیت سے کہا۔

''آپ کن مجرموں کی بات کر رہے ہیں ۔میں نہیں جانتا۔''

ڈاکٹر نے انسپکٹر کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''انسپکٹر ہی ہیز لوسٹ ہز میموری۔سر پر اتنے گہرے زخم لگے ہیں کہ ایسی حالت میں انسان بعض اوقات پچھلی تمام باتیں بھول جاتا ہے۔''

انسپکٹر شہریار کو گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔شہریار کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں پچھلی باتیں کیسے بھول گیا ڈاکٹر۔یہ کیسے ہو سکتا ہے۔میں خود کو پہچاننا چاہتا ہوں۔میں اپنے والدین کو ،اپنے دوست احباب کو اور اپنے آپ کو بھول کر کس طرح زندہ رہ سکتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔

''صبر کرو۔حوصلہ رکھو ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر تمہارے حافظہ کو صدمہ پہنچا ہو۔رفتہ رفتہ تمہیں بھولی ہوئی باتیں یاد آتی جائیں گی۔''

انسپکٹر نے پوچھا۔

''ڈاکٹر! کیا یہ اپنی کسی گمشدہ چیز کو پا کر اسے پہچان سکتا ہے۔''

''ہاں ایسا ممکن ہے۔''

انسپکٹر نے سپاہی کو حکم دیا۔''ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ایک تھیلا رکھا ہے' اسے لے آؤ۔'' سپاہی چلا گیا۔انسپکٹر نے شہریار سے کہا۔

''آج سے پانچ دن پہلے رات کے دو بجے لال گودام کی گلی میں تم بیہوش پڑے تھے۔''

شہریار نے پوچھا۔

''لال گودام کی گلی کہاں ہے۔؟''

''اسی شہر میں ہے''

''یہ کون سا شہر ہے۔''

انسپکٹر اسے مایوسی سے دیکھنے لگا۔اسی وقت سپاہی تھیلا لے کر آ گیا۔انسپکٹر نے تھیلے کو شہر یار کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''جہاں تم زخمی حالت میں پڑے تھے ،وہیں تمہارے قریب یہ تھیلا رکھا ہوا تھا ۔تم یاد کر کے بتاؤ کہ تم نے اس تھیلے میں کیا رکھا تھا۔؟''

وہ تھیلے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا ۔پھر اس نے پوچھا۔

''کیا یہ میرا تھیلا ہے۔''

انسپکٹر نے جواب دیا۔

''ہاں یہ تمہارا ہی ہوسکتا ہے۔اس مں ایک جوڑا کپڑا تھا تم نے لنڈے بازار سے خریدا تھا۔اس کے علاوہ پچاس روپے بھی تھے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک جوڑا کپڑا اور پچاس روپے لے کر میں کسی گلی میں کیوں گیا تھا۔کیا پچاس روپے کی خاطر کسی نے مجھے زخمی کیا تھا۔''

''نہیں!''انسپکٹر نے کہا۔''میرا خیال ہے۔تمہارے پاس زیادہ رقم تھی۔تمہیں لوٹ کر بھاگنے والوں سے یہ پچاس روپے کا نوٹ چھوٹ گیا اور تھیلے میں ہی رہ گیا۔بہرحال جس طرح انہوں نے تمہیں زخمی کیا ہے۔اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تم سے کوئی بڑی رقم یا کوئی اہم چیز چھین کر لے گئے ہیں یا پھر جو کچھ بھی ہوا ہے ۔وہ تم لوگوں کی ذاتی دشمنی کی بناء پر ہوا ہے۔مشکل تو یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو نہیں پہچان رہے ہو۔پھر کسی دشمن کو کیا پہچانو گے۔ورنہ میں اس علاقہ کے تمام غنڈوں کو شناختی پریڈ کے لیے تمہارے سامنے لے آتا۔ ویسے یہ تمام باتیں میں نے اس لیے کہہ دی ہیں کہ تم ان پر غور کرو۔ہوسکتا ہے کہ تمہیں کچھ یاد آ جائے۔میں کل پھر یہاں آؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ جانے لگا۔

وارڈ سے باہر آ کر اس نے ڈاکٹر سے کہا۔

''اس کا سر کا زخم اچھا ہو جائے اور پٹیاں اتر جائیں تو اس کی ایک تصویر لے کر اخباروں میں شائع کر دی

جائے گی ۔اس کے عزیزوں تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے۔آپ اس وارڈ میں ڈیوٹی کرنے والوں سے کہہ دیجیے کہ کوئی بھی شخص اس نوجوان سے باتیں کرے یا شناسائی ظاہر کرے تو اس کا نام اور پتا نوٹ کر لیں۔ان چیزوں سے تفتیش میں کافی مدد ملے گی۔اچھا سو آن۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

وارڈ کے اندر نرس اپنی میز کے قریب بیٹھی ہوئی بار بار شہریار کی جانب دیکھ رہی تھی۔ابھی اس نے ڈاکٹر کی زبان سے سنا تھا کہ وہ زخمی نوجوان اپنی یادداشت کھو چکا ہے اور اپنے پرائے کے علاوہ اپنا نام بھی بھول گیا ہے۔

''ہائے بے چارہ!'' وہ ہمدردی سے سوچنے لگی۔نہ جانے کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔اگر یہ شیو کرے اور عمدہ لباس پہن لے تو بالکل شہزادہ معلوم ہوگا۔

اسے کسی پڑھی ہوئی کہانی یا کسی دیکھی ہوئی فلم کے مناظر یاد آنے لگے۔ان مناظر میں ایک خوبرو ہیرو اپنی یادداشت سے محروم ہو کر شہر کی سڑکوں پر بھٹکتا پھر رہا تھا اور وہ نرس ہیروئن کے روپ میں اسے اپنی محبت کا سہارا دے رہی تھی۔

وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔اس نے چاروں طرف دیکھا' تمام مریضوں کی عیادت کے لیے ان کے عزیزوں اور رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔اک وہی تنہا تنہا سا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ قریب آ کر ہمدردی سے بولی۔

''کیا سوچ رہے ہو۔؟''

''آں۔''اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر اسے دیکھ کر جبراً وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں بہت کچھ سوچ رہا ہوں لیکن کوئی سوچ مجھے منزل تک نہیں لے جاتی۔''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔''

''شکریہ ! مجھے ایسے ہمدرد کی ضرورت ہے جو میرے متعلق صحیح معلومات حاصل کرے۔''

''میں کوشش کروں گی۔ویسے تمہارا یہ لباس دیکھوا تنا تو معلوم ہو گیا ہے کہ تم ایک غریب آدمی ہو۔''

''غریب ''! شہریار کو یہ لفظ کچھ جانا پہچانا سا معلوم ہوا' وہ اپنے لباس کو دیکھنے لگا۔

نرس نے کہا۔

''تمہاری انگلی میں یہ چاندی کا چھلا ہے' غریب کو سونے کی انگوٹھی نصیب نہیں ہوتی تو وہ چاندی پہن کر حسرت پوری کر لیتے ہیں۔''

وہ چاندی کے چھلے کو دیکھنے لگا' اسے یقین ہو رہا تھا کہ واقعی وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے' وہ قطعی بھول گیا تھا کہ وہ لباس اور چاندی کا وہ چھلا اس نے اپنے ملازم سے حاصل کیا تھا۔

اسے یہ سوچ کر کچھ عجیب سا لگا کہ وہ غریب ہے دوسروں سے کمتر ہے جس طرح پالتو جانور اپنے گلے کے پٹے سے پہچانے جاتے ہیں' اسی طرح چاندی کے ایک معمولی چھلے سے اس کی غربت پہچان لی جاتی ہے۔

وہ چھلے کو اپنی انگلی سے اتارنے لگا۔

نرس نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو۔''

اس نے بڑے دکھ سے جواب دیا۔

''یہ چھلا انگلی میں نہیں میری گردن میں پھنس رہا ہے۔''

''تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے ہوسکتا ہے کہ یہ کسی کے پیار کی نشانی ہو۔''

''پیار.........'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ہاں سوچنے کی کوشش کرو ہوسکتا ہے تم نے کسی لڑکی سے پیار کیا ہو اور اس لڑکی نے نشانی کے طور پر یہ چھلا تمہیں دیا ہو۔''

''لڑکی ......محبت کی نشانی ...... چھلا' انگلی کی زینت' گلے کا پھندا' غربت کا اشتہار '' تمام باتیں گڈمڈ ہو رہی تھیں' اس نے سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ بھی یاد نہ آیا' کالج گیٹ کے سامنے ایک حسین لڑکی نے اپنی محبت کا جو شعلہ بھڑکایا تھا وہ شعلہ بھی چنگاری بن کر راکھ تلے دب گیا تھا۔

سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

ہولے ہولے نیند غالب آنے لگی۔

پھر وہ سوچ کے سفر کا تھکا ہوا مسافر سو گیا۔

ایک ہفتہ کے بعد اس کے سر کی پٹیاں کھل گئیں صرف زخموں پر کراس پٹیاں رہ گئیں' انسپکٹر نے اسے بتایا کہ کل ایک حجام آ کر اس کا شیو بنائے گا اور ایک فوٹو گرافر اس کی تصویر اتارے گا' وہ تصویر اخباروں میں شائع کی جائے گی تا کہ اس کا کوئی رشتہ دار یا شناسا وہ تصویر دیکھ کر یہاں اسے لینے کے لیے آ جائے۔

انسپکٹر کے جانے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا' نرس نے اس کا ٹمپریچر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں بخار ہے' کمبل اوڑھ کر لیٹے رہو' باہر سردی ہے اگر ٹہلنے کے لیے جاؤ گے تو بخار تیز ہو جائے گا۔''

شہریار نے کہا۔

''اب بھی باہر جانے کو جی چاہتا ہے' یہاں پڑے پڑے اکتا گیا ہوں جدھر دیکھتا ہوں ادھر بیمار ہی بیمار نظر آتے ہیں۔''

نرس نے مسکرا کر کہا۔

''بیماروں کے درمیان زندگی گزارنا اور ایک نرس کی طرح مسکرانا بڑے حوصلے کی بات ہے تم مرد ہو تم میں یہ حوصلہ ہونا چاہیے پھر عیادت کا وقت ہو گیا ہے' دیکھو کتنی عورتیں ، مرد اور بچے یہاں اپنے بیمار مریضوں کے دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں تم ان کے ہنستے بولتے چہرے دیکھو ہو سکے تو ان سے شناسائی پیدا کرو' تمہارا وقت اچھا گزر جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے مریض کی طرف چلی گئی۔

وہ اپنے آس پاس دیکھنے لگا' ہر مریض کے پاس عورتیں ، مرد اور بچے نظر آ رہے تھے کوئی دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا کوئی اونچی آواز میں قہقہے لگا رہی تھی کھنکتی ہوئی چوڑیاں ، گنگناتے ہوئے قہقہے' زندگی کی کتنی ہی مسرتوں کی غمازی کر رہے تھے لیکن ان مسرتوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔

اس نے سرہانے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا۔''

ایک غریب آدمی کی تصویر اخباروں میں شائع ہو جائے تب بھی کوئی نہیں آئے گا اس کی تصویر کو دیکھ کر

اونہہ کرے گا اور پھر گزر جائے گا۔

''یہ جھوٹ ہے کہ کسی لڑکی نے اسے چاندی کا چھلا نشانی کے طور پر دیا ہے' یہ چاندی چمکتی ہے وہ چہرہ کیوں نہیں جھلکتا۔ کہاں ہے وہ چہرہ۔ میرے ذہن کے تاریک پردے میں چھپ کر آنکھ مچولی کیوں کھیل رہا ہے۔

''نہیں یہ سب بہلاوا ہے' فریب ہے' مجھے کسی عزیز کی تلاش کسی رشتہ کا انتظار اور کسی محبت کی آرزو نہیں کرنی چاہیے یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

نگاہوں کے سامنے پلنگ کے پائنتی ریشم کھڑی ہوئی تھی ایک لمحہ کے لیے وہ دونوں بالکل ساکت ہو گئے۔

یہ اسے دیکھتی رہی وہ اسے دیکھتا رہا۔

یہ سوچ رہی تھی کہ نئے ماڈل کی مرسڈیز میں بیٹھنے والا رئیس زادہ ایک خیراتی ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا ہوا ہے نہیں نہیں یہ کوئی اور ہے اس رئیس زادے سے مشابہت رکھتا ہے اس کے چہرہ پر رونق اور بشاشت نہیں ہے یہ تو سوکھا اور باسی چہرہ ہے ،ایسے چہرے غریبی کے دکھ ،حادثے اور بیماریاں بناتی ہیں' نہیں یہ وہ نہیں ہے جو مجھ سے پھول مانگ رہا تھا' غریب آدمی پھول نہیں مانگتا روٹی مانگتا ہے۔

''ریشم ''! کسی عورت نے آواز دی۔

''آئی بھابی''! وہ جلدی سے پلٹ کر بولی اور دور ایک مریض کی طرف جانے لگی جہاں اس کی بھابی کھڑی ہوئی تھی۔

شہر یار اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

وہ چہرہ اسے جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔

'کہیں دیکھا ہے اسے کہیں دیکھا ہے وہ چہرہ حافظے سے یوں جھلک رہا تھا جیسے ہلکورے مارتے ہوئے پانی میں چاند کا عکس ٹکڑے ٹکڑے ہو کر جھلکتا ہے' یادداشت کے کینوس پر مکمل تصویر نہیں تھی' تقدیر کے ہاتھوں نے

اس تصویر کو ادھر ادھر سے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ دور ایک مریض کے پاس کھڑی ہوئی اپنی بھابی سے باتیں کر رہی تھی اور کبھی کبھی اس کی جانب سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

دونوں ہی سوچ رہے تھے اور دونوں ہی بھٹک رہے تھے' ریشم کو کسی اجنبی سے دلچسپی نہیں تھی اسے اپنے بھائیوں سے اپنی بھابی سے اور اپنے گھر سے دلچسپی تھی اور اپنی کتابوں سے محبت تھی' اس کی سوچ کا دائرہ ، بہت مختصر تھا اس نے کبھی کسی اجنبی کو اس دائرے کے اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

اب بھی سوچ نگر میں کوئی نہیں تھا' صرف ایک پھول تھا' اس پھول کے پیچھے کسی اجنبی کی دھندلی سی شخصیت آ جائے تو یہ دوسری بات ہے وہ تو صرف پھول کے متعلق سوچتی تھی ، کہ جب تک وہ اس کے بالوں میں ہے ،اس وقت تک وہ پھول کنوارا ہے اگر وہ کسی سر پھرے کے ہاتھ لگ گیا تو پھر وہ ایک کنواری لڑکی کا غرور ہار جائے گی۔

اور وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی ،اسے بھی جیتنے کی ضد تھی۔

وہ بھی ضدی تھا یہ بھی ضدی تھی اس لیے وہ پھول کے تحفظ ،اپنی ضد کی بقا اور اپنے غرور کی سلامتی کے لیے سوچتی تھی اور ان کی سوچوں کے درمیان آپ ہی آپ اس اجنبی کی دھندلی سی شخصیت چلی آتی تھی اس عمر میں لاکھ دامن بچاؤ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی بہانے ذہن کے کسی گوشہ میں اپنا سکہ جما لیتا ہے۔

وہ جو بار بار پلٹ کر اسے دیکھ رہی تھی تو محض اس لیے کہ اس نوجوان نے ایک پھول کو اس کا سرمایہ حیات بنا دیا تھا اور بڑے مستحکم لہجہ میں کہا گیا تھا کہ وہ ضرور اور ضرور اپنے ہاتھوں سے اسے ایک پھول پیش کرے گی۔

''اونہہ ! بڑا آیا مجھے چیلنج کرنے والا مجھے نادان اور کمزور سمجھتا ہے یہ نہیں جانتا کہ میں کتنی ضدی لڑکی ہوں' ایسے عشقیہ مکالموں سے پگھلنے والی نہیں ہوں۔''

وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی اس کی بھابی نے پوچھا۔

''یہ تم بار بار اس مریض کو کیوں دیکھ رہی ہو۔''

''آں......'' وہ چونک گئی اسے یوں محسوس ہوا جیسے چوری کرتی ہوئی پکڑ لی گئی ہو لیکن بھابی کی نگاہوں

میں کوئی تجسس نہ تھا' وہ سنبھل کر بولی۔

''وہ ...... بھابی! وہ جو مریض ہے نا اسے دو ہفتہ پہلے میں نے دیکھا تھا وہ ایک بہت ہی قیمتی سوٹ میں اور ایک نئے ماڈل کی مرسڈیز میں نظر آیا تھا لیکن آج یہ پھٹے پرانے لباس میں یہاں اس خیراتی ہسپتال میں نظر آ رہا ہے کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔؟''

اس کی بھابھی نے ناگواری سے کہا۔

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے تم بھی تو رئیس زادی بن کر کالج میں پڑھنے جاتی ہو کوئی گھر کی چار دیواری میں آ کر ہماری غربت کو دیکھ لے تو سارا بھرم کھل جائے گا' تم دوسروں کو تعجب سے کیا دیکھتی ہو اپنے بھائی کو سمجھاؤ کہ تمہاری تعلیم میں پیسے ضائع نہ کرے تم پڑھ لکھ کر سچ مچ رئیس زادی تو نہیں بن جاؤ گی ''

ریشم نے جواب دیا۔ ''میں رئیس زادی بننے کے لیے نہیں علم حاصل کرنے کے لیے پڑھتی ہوں آپ تو ہمیشہ الٹی باتیں کرتی ہیں آپ کو تو یہی فکر کھائے جاتی ہے کہ بھائی جان میرے لیے پیسے کیوں برباد کرتے ہیں۔'' بستر پر لیٹے ہوئے مریض نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ریشم! خاموش ہو جاؤ یہ تو سوچو کہ یہ گھر نہیں ہسپتال ہے تم دونوں کو کہیں بھی لڑنے سے فرصت نہیں ملتی ہے۔''

''آپ مجھے ہی کہہ رہے ہیں بھابی کو کچھ نہیں کہتے۔''

''میں تم دونوں سے کہہ رہا ہوں اب یہاں سے جاؤ ملنے کا وقت ختم ہو رہا ہے خدا کا شکر ہے کہ بیمار ہو کر ہسپتال آ گیا ہوں اب یہاں کچھ روز سکون سے رہوں گا۔''

ریشم خدا حافظ کہہ کر جانے لگی شہریار کے بیڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا لیکن اس کے قدم نہیں رکے وہ آگے بڑھتی چلی گئی' دروازے پر نرس نے اسے روک لیا تھا۔

''پلیز! میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''پوچھئے''! ریشم نے کہا۔

نرس شہریار کی جانب اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

''وہ جو چار نمبر بیڈ پر نوجوان ہے کیا آپ اسے جانتی ہیں۔''

ریشم کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نوجوان کے ساتھ اس کی کہانی بنتی جا رہی ہے اور یہ کہانی آپ ہی آپ عام ہو رہی ہے وہ پریشان ہو کر بولی۔

''نن......نہیں تو ،وہ میں اسے کیسے جان سکتی ہوں وہ میرے لیے قطعی اجنبی ہے۔''

''مگر آپ تو بار بار اس کی جانب ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے پہلے کی جان پہچان ہو۔''

دل کی چوری چھپ جاتی ہے نظروں کی چوری نہیں چھپتی اس نے ہچکچاتے ہوئے دور بیٹھے شہر یار کو دیکھا پھر بولی۔

''کیا اس مریض نے آپ سے کہا ہے کہ میں اسے جانتی ہوں۔؟''

''نہیں وہ بیچارہ کیا کہے گا وہ تو اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔''

ریشم کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی' نرس نے کہا۔

''کسی دشمن نے اسے مار ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ گیا اسے دوسری زندگی مل گئی لیکن یہ اپنی پچھلی زندگی کو بھول گیا ہے یہ نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔حتی کہ اپنا نام بھی اسے یاد نہیں رہا۔''

دور بیٹھا ہوا شہر یار اس کی جانب دیکھ رہا تھا اس وقت وہ بہت ہی مظلوم ،معصوم اور ہمدردی کا مستحق نظر آ رہا تھا۔

ریشم نے ہمدردی سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے اگر میں اس کے متعلق کچھ جانتی تو ضرور اس کے عزیزوں تک اسے پہنچا دیتی۔''

یہ کہہ کر وہ بوجھل قدموں سے وارڈ کی دہلیز کو پار کرنے لگی۔

قدم آگے بڑھنے سے انکار کر رہے تھے اور وہ جا رہی تھی برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے کھڑکی سے دیکھا وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا وارڈ کے دروازے کو اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی اس کی اداسی دل میں چبھ رہی تھی' آگے وارڈ کی دوسری کھڑکی آ گئی اس

کھڑکی کے پاس اس کا بڑا بھائی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی بھابی قریب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔

وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

تیسری کھڑکی کے پاس اس کے قدم رک گئے وہ دور بہت دور نظر آ رہا تھا۔

'ہاں اتنی دوری اچھی ہے' ایک اجنبی سے جو شناسا بھی ہے' اتنی دوری مناسب ہے۔'

''میں اسے دیکھ سکتی ہوں اس سے ہمدردی کر سکتی ہوں لیکن اس کے کسی کام نہیں آ سکتی۔''

'اس نے مجھ سے پھول مانگا تھا اور آج اپنی خالی خالی نگاہوں سے اپنی زندگی کے گمشدہ لمحوں کا حساب مانگ رہا تھا بڑی خاموشی سے پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ ہم کہاں ملے تھے۔ وہ زندگی کا کون سا خوب صورت موڑ تھا جہاں دو اجنبیوں کے درمیان ایک پھول کھلتا اور مسکراتا ہے۔'

وہ سر جھکا کر کھڑکی کے پاس سے پلٹ گئی ان خاموش نگاہوں کے سوال کا جواب نہ دے سکی نرس کو بھی یہ نہ بتا سکی کہ وہ اسے پہچانتی ہے ایسے پہچانتی ہے جیسے دل اپنی دھڑکنوں کو ،زندگی اپنی سانسوں کو اور پھول اپنی زلفوں کو پہچانتا ہے اسی طرح وہ بھی پہچانتی ہے لیکن یہ بات وہ کس کو کیسے سمجھائے کہ بعض اوقات اتنی شناسائی کے باوجود اجنبیت باقی رہ جاتی ہے۔

کچھ باتیں صرف سمجھنے کے لیے ہوتی ہیں سمجھانے کے لیے نہیں ہوتیں وہ ڈگمگاتی ہوئی اور سنبھلتی ہوئی ہسپتال کے برآمدے سے یوں گزرنے لگی جیسے نامراد پاؤں کوئے یار سے دل برداشتہ ہو کر گزرتے ہیں۔



بیگم بشارت ایزی چیئر پر لیٹی ہوئی شہریار کو دیکھ رہی تھیں' سامنے مینٹل پیس پر ان کا بیٹا مسکرا رہا تھا ان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

دوسری کرسی پر زینب آپا بیٹھی ہوئی ان کی ممتا کو محسوس کر رہی تھیں بیگم بشارت اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے زینب آپا اور اپنے بیمار بہنوئی وقار علی کو یہاں لے آئی تھیں ان کے ساتھ ان کا بیٹا نثار اور اس کی بیوی بچے

بھی آ گئے تھے۔ گھر میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی پھر بھی ماں اپنے دل کی ویرانی میں بھٹکتی رہتی تھی۔

انہوں نے گہری اداسی سے کہا۔

''نہ جانے اس وقت میرا لعل کہاں ہوگا۔'' زینب آپا نے کہا۔

''وہ جہاں بھی ہوگا خیریت سے ہوگا ماشاء اللہ بڑا سمجھدار لڑکا ہے' اتنے بڑے ہوٹل کا کاروبار کتنی خوش اسلوبی سے چلا رہا ہے' ایک میرا نثار ہے کبھی مستقبل مزاجی سے کوئی کام نہیں کرتا نہ جانے کیا کیا کاروبار کرتا رہتا ہے' ہماری ساری جمع پونجی ڈبو کر رکھ دی ہے اب کہیں ملازمت تلاش کرتا پھر رہا ہے۔'' نثار نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''جب دیکھو امی میری شکایت کرتی رہتی ہے خالہ جان! کاروبار میں نفع نقصان ہوتا ہی رہتا ہے آپ ہی بتائیے کیا میں نے جان بوجھ کر نقصان اٹھایا ہے۔''

بیگم بشارت نے کہا۔

''نہیں بیٹے! کوئی جان بوجھ کر اپنا نقصان نہیں کرتا جو ہونا تھا، ہو گیا اسے بھول جاؤ میں چاہتی ہوں کہ شہریار کی واپسی تک تم ہوٹل کا کام سنبھال لو منیجر روزانہ آمدو خرچ کا حساب لے کر آ جاتا ہے۔ اس بڑھاپے میں مجھ سے یہ حساب کتاب نہیں سنبھالا جاتا تم ہوٹل چلے جایا کرو مجھے اطمینان رہے گا کہ کاروبار اپنے ہی بھانجے کی نگرانی میں ہے۔

زینب آپا خوش ہو گئیں' نثار نے بیگم بشارت کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''خالہ جان! آپ بہت اچھی ہیں' آپ نے مجھے ایک ذمہ داری سونپ کر امی کے طعنوں سے بچا لیا ہے اب میں بتاؤں گا کہ میں بھی شہریار کی طرح ذہین ہوں میں ہوٹل کی آمدنی کو اتنا بڑھاؤں گا کہ شہریار بھی حیران رہ جائے گا۔''

''خدا تمہیں نیکی اور ذہانت دے جاؤ ہوٹل فون کر کے منیجر کو بلاؤ میں ابھی اسے سب باتیں سمجھائے دیتی ہوں۔''

''ابھی جاتا ہوں مگر وہ خالہ جان! مجھے، مجھے پانچ سو روپے کی ضرورت ہے آپ کی بہو کے لیے۔''

زینب آپا نے بات کاٹ کر کہا۔

''تمہیں ہر وقت پیسے مانگتے شرم نہیں آتی بیوی کے لیے کچھ لانا ہے تو اپنی محنت کے پیسوں سے لاؤ میں تو تمہاری شادی کر کے پچھتا رہی ہوں'' بیگم بشارت نے کہا۔

''آپا ......! آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے نثار مجھ سے نہیں مانگے گا تو اور کس سے مانگے گا جاؤ بیٹا ادھر آئینہ کے پاس میرا وینٹی بیگ رکھا ہے اس میں سے روپے نکال لو۔''

نثار اٹھ کر آئینے کے پاس آ گیا' میز پر سفید لیدر کا وینٹی بیگ رکھا ہوا تھا اسے کھولتے ہی نثار کی آنکھیں کھل گئیں' سو سو اور ہزار کے نوٹوں سے بیگ بھرا ہوا تھا اس کے دل مس ایک ہلچل سی ہونے لگی' اس نے پلٹ کر دیکھا اس کی امی اور خالہ جان باتوں میں مصروف تھیں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ جسے اتنے بڑے ہوٹل کی ذمہ داریاں سونپی جا رہی ہیں وہ چند نوٹوں کے لیے بے ایمان بن جائے گا۔

اس نے ہزار کا ایک نوٹ نکال کر جیب میں چھپا لیا اور پانچ سو کا ایک نوٹ ہاتھ میں لے کر بولا۔

''خالہ جان! آپ اتنے روپے لاپرواہی سے رکھ دیتی ہیں' کسی ملازم کی نیت خراب ہو گئی تو چرا کر لے جائے گا۔''

''نہیں بیٹے! سب ہی ملازم ایماندار ہیں۔ میرے ہاں آج تک کسی نے کبھی چوری نہیں کی، مجھے تو ان پر اتنا بھروسہ ہے کہ میں کبھی پیسے گن کر نہیں رکھتی۔''

زینب آپا نے پوچھا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ جب تم پیسے گن کر نہیں رکھتی ہو تمہیں چور کا پتہ کیسے چلے گا۔؟''

''ایک نہ ایک دن پتہ چل ہی جاتا ہے آپا آج چوری کرنے والے کل اپنی کسی غلطی سے پکڑے ہی جاتے ہیں کیوں نثار۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔'' نثار نے گھبرا کر کہا۔

''نن نہیں خالہ جان! آپ درست فرما رہی ہیں میں منیجر کو فون کر کے ابھی آتا ہوں۔''

وہ تیر کی طرح کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

ہر انسان اپنے نظریے کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ بیگم بشارت ایمان دار تھیں' اس لیے دوسروں کو بھی

ایماندار سمجھتی تھیں، نثار بے ایمان تھا اس لیے اس کا نظریہ تھا کہ پیسہ ہمیشہ بے ایمانی سے حاصل ہوتا ہے۔

جب وہ ہوٹل کاؤنٹر پر آ کر بیٹھا تو پہلے دن اس نے دو ہزار روپے کی بے ایمانی کی، ہوٹل کی آمدنی اتنی تھی کہ منیجر کو بھی روپے کی کمی کا پتہ نہ چلا پھر روزانہ اتنی بڑی رقم ہاتھ آنے لگی تو وہ ہوٹل اس کے لیے سونے کی کان بن گیا، لالچ اور بڑھنے لگا لیکن لمبا ہاتھ مارنے کے لیے منیجر سے ساز باز کی ضرورت تھی اور منیجر اسے کسی حد تک ایماندار اور شہریار کا وفادار نظر آ رہا تھا۔

اس کے سامنے دو ہی راستے تھے ایک تو یہ کہ اس کے خلاف بیگم بشارت کے کان بھر کر اس ملازمت سے برطرف کر دیا جائے دوسرے یہ کہ اس کی کوئی کمزوری معلوم کر کے اسے اپنی مٹھی میں کر لیا جائے لیکن ایک ہفتہ گزر گیا، منیجر اس کے ہتھے نہیں چڑھا، دوسری طرف بیگم بشارت نے اس کے خلاف شکایتیں سن کر کہا کہ ’وہ بہت پرانا ملازم ہے اور اس سے چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہو جائیں تو انہیں نظر انداز کر دیا کرو۔ بیٹے میں تو اتنا جانتی ہوں کہ خداوند کریم نے میرے اور میرے بچے کے نام جو لکھ دیا ہے، وہی ہمیں ملے گا۔ اس سے زیادہ کا ہمیں لالچ نہیں ہے۔‘‘

نثار کو بھی زیادہ کا لالچ نہ ہوتا روزانہ دو ہزار روپے کی آمدنی بہت زیادہ تھی لیکن اس کی بیوی رقیہ بیگم کی ضروریات بڑھتی جا رہی تھیں وہ ہر رات روپیٹ کر اس سے مزید روپے وصول کر لیا کرتی تھی اپنی ساس سسر اور بیگم بشارت سے چھپ کر اس نے بینک اکاؤنٹ کھول لیا تھا۔ سونے کے زیورات خرید کر اپنے میکے بھیج دیا کرتی تھی، ابھی دو ہی ہفتوں کی آمدنی میں اتنا کچھ ہو گیا تھا آئندہ زمینیں خریدنے کا ارادہ تھا پیسے کی آمد ہوتی ہے تو بڑے بڑے منصوبے دماغ میں کلبلانے لگتے ہیں اسی لیے نثار آمدنی بڑھانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔

پھر ایک صبح اخبار دیکھتے ہی وہ پریشان ہو گیا، اخبار کے ایک اندرونی صفحہ پر شہریار کی تصویر شائع ہوئی تھی تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا تھا۔

’’یہ نوجوان اپنی یادداشت سے محروم ہو چکا ہے۔‘‘

نثار تصویر کو بار بار دیکھ رہا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہریار کی تصویر ہے، اس کی معلومات کے مطابق شہریار جرمنی گیا ہوا تھا لیکن اس کی تصویر مقامی اخبار میں شائع ہوئی تھی وہ تفصیلی خبر پڑھنے لگا۔

''۶ ستمبر کی رات کو تین بجے یہ نوجوان لال گودام کی گلی میں زخمی حالت میں بے ہوش پایا گیا ہے ان دنوں حاجی احمد دین کے خیراتی ہسپتال میں زیر علاج ہے کسی دشمن نے اس کے سر پر ایسی شدید ضربیں لگائی ہیں کہ وہ دماغی طور پر مفلوج ہوگیا ہے فی الحال پولیس یہ رائے قائم کر رہی ہے کہ اس گمنام اجنبی کے پاس اچھی خاصی رقم تھی جسے غنڈے چھین کر فرار ہوگئے ہیں یا پھر کسی نے ذاتی بناء پر اس ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنے مقصد میں ناکام رہا ،یہ تصویر اس مقصد سے شائع کی گئی ہے کہ اس کے عزیز' رشتہ دار یا کوئی بھی پہچاننے والا فوری طور پر ہسپتال کے انچارج یا کسی بھی تھانے سے ابطہ قائم کرے تاکہ یہ نوجوان گمنامی کے پردے سے باہر آجائے۔''

نثار نے اخبار کے اس صفحے کو دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا' اس کے سازشی دماغ نے کہا کہ اسے گمنامی کے پردے میں ہی رہنا چاہیئے' بیگم بشارت کو اخبار پڑھنے سے دلچسپی نہیں ہے۔اس لیے کوٹھی میں اخبار نہیں جاتا ہے وہ بیٹے کی تصویر نہیں دیکھ سکیں گی البتہ شہریار کے دوست احباب اخبار دیکھ کر ہسپتال تک پہنچ سکتے ہیں یا مختلف ذرائع سے بیگم بشارت کو اس حادثے کی اطلاع مل سکتی ہے لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں' ہوسکتا ہے کہ آج اطلاع نہ ملے پرسوں بھی نہ ملے جتنے دن ماں اپنے بیٹے سے بے خبر رہے گی' اتنے دنوں تک ہوٹل سے حاصل ہونے والے دو ہزار روپے اس کی جیب میں جاتے رہیں گے۔

اس نے اخبار کا وہ صفحہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا کہ مینیجر یا دوسرے ملازم نہ دیکھ سکیں۔

مینیجر کا خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ وہ شہریار کو ایئر پورٹ تک رخصت کرنے گیا تھا یہ بات بیگم بشارت سے معلوم ہوئی تھی اور اب یہ بات غلط ثابت ہوئی تھی یا تو مینیجر اسے رخصت کرنے نہیں گیا تھا یا پھر شہریار جرمنی جانے کے بہانے ایک بڑی قم لے کر کسی محبوبہ یا کسی داشتہ کے ہاں چند ماہ گزارنا چاہتا تھا اکثر رئیس زادے والدین سے جھوٹ بول کر اس طرح عیاشی کرتے ہیں شہریار بھی شاید مینیجر کو راز دار بنا کر اسی مقصد کے لیے نکلا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں کسی نے اسے لوٹ لیا' اخبار کی خبر بھی یہی کہتی ہے۔

اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا' وہ کاؤنٹر سے اٹھ کر مینیجر کے کمرے کی طرف جانے لگا۔

مینیجر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا گوشت اور سبزیوں کا حساب کر رہا تھا نثار نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور اس کے قریب آ کر ایک کسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''شہر یار کہاں گیا ہے۔؟''

مینیجر نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا کر کہا۔

آپ تو جانتے ہیں وہ جرمنی گئے ہیں۔''

''کیا تم اسے سی آف کرنے ایرپورٹ گئے تھے۔؟''

مینیجر کا ماتھا ٹھنکا کہ اس سوال کے پیچھے ضرور کوئی خاص بات ہے' وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

'ج جی ہاں میں سی آف کرنے گیا تھا۔'

''خالہ جان سے بھی تم نے یہی کہا ہے۔''

''جی ہاں مگر اس میں جھوٹ کیا ہے۔؟''

''جھوٹ اور سچ کا ابھی پتا چل جائے گا تم یہ بتاؤ کہ اگر شہر یار اسی شہر میں کسی حادثے کا شکار ہو جائے اور زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا ہو جائے اور یہ بات خالہ جان کے علم میں آ جائے تو کیا تمہاری یہ نوکری سلامت رہے گی۔؟''

مینیجر بوکھلا کر اسے تکنے لگا۔

''آپ.. آپ کیا کہہ رہے ہیں۔خدا نہ کرے کہ شہر یار صاحب کو کوئی حادثہ پیش آئے۔''

نثار نے جیب سے اخبار کا صفحہ نکال کر کھولا اور اسے مینیجر کے سامنے رکھ دیا شہر یار کی تصویر پر نظر پڑتے ہی منیجر کی بوکھلاہٹ بڑھ گئی وہ صفحہ کو اٹھا کر جلدی جلدی پڑھنے لگا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''ہمیں فورا" ہسپتال پہنچنا چاہیے۔''

نثار نے اسے دھکا دے کر جبرا" کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو پہلے میرے سوالوں کا جواب دو۔''

''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔؟''

''تم ایئر پورٹ نہیں گئے تھے۔''

''نہیں!''

''شہریار یقیناً" سفر کے سامان کے ساتھ گھر سے نکلا ہوگا اتنے سامان کے ساتھ وہ کہاں گیا تھا۔؟''

وہ پریشان ہوکر بولا۔

''اب تو بات کھل گئی ہے بیگم صاحبہ کو سب کچھ بتانا ہوگا آپ بھی سن لیجیے وہ جرمنی نہیں گئے وہ اس بہانے کہاں جانا چاہتے تھے ،انہوں نے مجھے نہیں بتایا مجھے حکم دیا کہ ان کا سامان لاکر یہاں اپنے کمرے میں چھپا کر رکھ دوں وہ سامان اب تک میرے اسٹور روم میں پڑا ہوا ہے۔'' نثار نے حکم دیا۔

''چلو اٹھو مجھے وہ سامان دکھاؤ۔''

منیجر اٹھ کر اسٹور روم کے دروازے کے پاس آیا اور جیب سے چابی نکال کر اسے کھولنے لگا۔

نثار نے پوچھا۔

''اس دروازے کی دوسری چابی کہاں ہے۔؟''

''میز کی دراز میں ہے۔''

دروازہ کھلنے کے بعد نثار نے دیکھا اسٹور روم میں منیجر کے سوٹ کیس ،بستر کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی کرسیوں کے درمیان شہریار کے دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔

اس نے منیجر سے چابی لے کر دروازے کو دوبارہ لاک کر دیا اور میز کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

''پولیس کو اس مجرم کی تلاش ہے جو ایک رات شہریار کو لوٹ کر چلا گیا لوٹے ہوئے مال کا کچھ سامان تمہارے اسٹور روم میں ہے باقی نقد رقم پولیس تم سے اگلوا لے گی۔''

وہ گھبرا کر بولا۔

''یہ ،یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔کیا آپ مجھے مجرم سمجھتے ہیں۔''

''صرف میں نہیں پولیس بھی یہ دو سوٹ کیس برآمد کرنے کے بعد تمہیں مجرم کہے گی خالہ جان بھی یہ گواہی دیں گی کہ تم نے ایئر پورٹ تک جا کر شہریار کو رخصت کرنے والی بات کہہ کر انہیں بھی دھوکے میں رکھا

ہے۔

اب تم غور سے سنو کہ میں پولیس اور خالہ جان کے سامنے کتنی دلچسپ اور سچی کہانی پیش کروں گا۔

کہانی یہ ہے کہ شہریار عام رئیس زادوں کی طرح ایک عیاش نوجوان ہے تم نے اسے ایک عورت کے جال میں پھانس رکھا ہے خالہ جان اسے راتوں کو گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں اس لیے تم نے اسے مشورہ دیا کہ وہ جرمنی جانے کے بہانے چار چھ ماہ کے لیے اس کے پاس چلا جائے۔''

''یہ جھوٹ ہے ''! اس نے چیخ کر کہا۔

''چلاؤ مت...... پولیس چیخ پکار نہیں سنتی وہ ٹھوس ثبوت کو دیکھتی ہے وہ یہی دیکھے گی کہ شہریار نے تمہارے مشورے پر عمل پر کیا اسی لیے اس نے یہ سامان چھپا کر تمہارے پاس رکھ دیا اور اچھی خاصی رقم لے کر اپنی داشتہ کے پاس جانے لگا لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی تم نے اسے زخمی کر دیا اور وہ رقم لے کر کہیں چھپا دی اور بدستور ایک وفا دار ملازم کی طرح کام کرنے لگے تا کہ تم پر کوئی شبہ نہ کرے تم نے سمجھا تھا کہ وہ تمہارے حملہ سے ہلاک ہو گیا اور دوسرا کوئی تمہاری نشاندہی کرنے والا نہیں ہے مگر افسوس کہ وہ زندہ رہ گیا۔

اگر تم مجرم نہیں ہو تب بھی شہریار تمہاری حمایت میں کچھ نہیں کہے گا کیونکہ وہ اپنی پچھلی زندگی کو بھول چکا ہے وہ تمہیں تو کیا اپنی والدہ کو بھی نہیں پہچان سکے گا اور اس کی والدہ کو تم اچھی طرح جانتے ہو تم نے ان سے جھوٹ کہا ہے اس لیے وہ بھی میری کہانی پر یقین کریں گے کہ شہریار تمہاری سازشوں کا شکار ہوا ہے۔ اب تم ٹھنڈے دماغ سے سوچو کہ تم کس مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔؟''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آپ ایسا جھوٹا الزام کیوں لگانا چاہتے ہیں۔ آپ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے۔''

وہ مسکرا کر بولا۔

''میں دشمن نہیں ہم تم سے بھلائی کرنا چاہتا ہوں تمہیں ان الزامات سے بچانا چاہتا ہوں یاد رکھو' اگر میں نے تمہارے خلاف کچھ نہ کیا تب بھی خالہ جان تمہارے جھوٹ کو نظر انداز نہیں کریں گی اور تمہارے خلاف بیان دیں گی پولیس تم سے ایک ہی سوال کرے گی کہ تم شہریار کو جرمنی پہنچانے کے بہانے کسی جگہ لے گئے تھے

اور یہ بات تم نے بیگم صاحبہ سے کیوں چھپائی تھی۔''

''مجھے شہریار صاحب نے کہا تھا۔''

''مگر شہریار اب تمہارے بچاؤ کے لے کچھ نہیں کرے گا جو اپنے آپ کو بھول گیا ہو وہ تمہاری سچائی کو کیا پہچانے گا۔''

منیجر شکست خوردہ انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اوہ ،میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں میری برسوں کی وفاداری خاک میں مل رہی ہے میں واقعی بیگم صاحبہ کی نظروں سے گر جاؤں گا یہاں شہریار صاحب کا سامان دیکھ کر پولیس مجھے شبہ میں گرفتار کرے گی صرف شہریار صاحب ہی میری بے گناہی کا یقین دلا سکتے ہیں لیکن وہ اس قابل نہیں ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔؟''

''میں بتاتا ہوں تم شہریار کو بھول جاؤ یہ سمجھ لو کہ وہ اس شہر میں نہیں ہے۔''

''میرے سمجھنے سے کیا ہوگا وہ تو اس شہر کے ایک ہسپتال میں موجود ہیں۔''

''میں اسے ہسپتال سے دور لے جاؤں گا خالہ جان کو اس کی خبر تک نہ ہوگی۔''

''وہ کیسے؟۔''

''ایسے کہ میری بیوی رقیہ اپنے بھائی کو ہسپتال بھیجے گی' اس کا بھائی شہریار کو اپنا بھائی ظاہر کرے گا وہ پولیس کو بیان دے گا کہ اس کا بھائی آوارہ لوگوں کی صحبت میں بگڑ گیا ہے گھر سے ایک لاکھ روپے لے کر بھاگ گیا تھا شاید وہی روپے حاصل کرنے کے لیے کسی غنڈے نے اسے زخمی کر دیا ہے۔''

منیجر نے کہا۔''مگر یہ تو ایک جرم کو چھپانے کے لیے دوسرا جرم ہو جائے گا۔''

''جرم نہیں تمہاری بھلائی ہوگی رقیہ کا بھائی اسے اپنے ہاں رکھے گا اور اس کی یادداشت واپس لانے کی کوشش کرے گا اگر وہ کامیاب ہو گیا اور اس کی یادداشت واپس آ گئی تو ہم اسے یہاں لے آئیں گے پھر تم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا۔''

''ہاں شہریار صاحب کی یادداشت واپس آ جائے تو وہ مجھے تمام الزامات سے بچا لیں گے۔''

''اب تمہاری سمجھ میں بات آئی ہے لاؤ وہ اسٹور روم کی دوسری چابی بھی مجھے دے دو۔''

''کیوں؟۔''

''میں نہیں چاہتا کہ تم موقع پا کر دونوں سوٹ کیس اسٹور روم سے غائب کر دؤ میں تمہاری ایک کمزوری اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہوں۔''

''اس کا کیا مطلب ہوا۔''

''مطلب آہستہ آہستہ سمجھ میں آ جائے گا میں جیسا کہتا ہوں ویسا ہی کرتے جاؤ دیر نہ کرو چابی میرے حوالے کر دو ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں ابھی میں دوست بن کر تمہاری بھلائی کر رہا ہوں۔ میرے حکم سے انکار کرو گے تو میں ایک پل میں دشمن بن جاؤں گا پولیس کو فون کر کے یہاں بلا لاؤں گا اور اس سامان کے ساتھ تمہیں گرفتار کرا دوں گا۔''

منیجر نے خاموشی سے دراز کھول کر چابی نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔

نثار نے دونوں چابیوں کو جیب میں رکھ کر کہا۔

''شہریار کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے رقیہ کا بھائی اسے اپنے ساتھ لے جائے گا تو اس کی دیکھ بھال اور آرام و آسائش کے لیے روپے کی ضرورت ہو گی تم روزانہ کیش میں سے تین ہزار روپے دیا کرنا۔''

''روزانہ تین ہزار؟۔'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں روزانہ یعنی مہینے میں نوے ہزار روپے اس سے کم میں ایک رئیس زادے کی پرورش نہیں ہو سکے گی تم آج کی رقم تیار رکھو میں رقیہ سے مل کر ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

منیجر پریشان نظروں سے کبھی اس دروازے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے نثار باہر گیا تھا اور کبھی اسٹور روم کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا، جہاں اس کے ناکردہ جرم کا ثبوت رکھا ہوا تھا پھر وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر میز پر جھک گیا۔



شہر یار دوائی پی کر لیٹ گیا' اسے ہلکا ہلکا بخار تھا۔

نرس نے اس کے اوپر کمبل ڈالتے ہوئے کہا۔

''بخار ہے کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تمہیں جن دواؤں کی ضرورت ہے وہ ہسپتال میں نہیں ہیں اور تمہارے لیے بازار سے خریدنے والا کوئی نہیں ہے میری تنخواہ ایک ہفتہ بعد ملے گی ورنہ میں ہی تمہارے لیے دوائیں لے آتی۔''

شہر یار نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور کہا۔

''سسٹر! آپ بہت اچھی ہیں لیکن یہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کوئی مجھ پر ترس کھائے نہ جانے میں کون ہوں ،کس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں مگر اتنا تو سمجھتا ہوں کہ مجھ میں خودداری ہے آہ! یہ غریبی ایک لعنت ہے میں خیرات لینا نہیں چاہتا لیکن غربت نے مجھے خیراتی ہسپتال میں پہنچا دیا ہے۔''

نرس نے کہا۔

''مجھے یوں لگتا ہے کہ تم غریب نہیں ہو پچھلی رات تم شدید بخار کی حالت میں بڑبڑا رہے تھے کسی سے کہہ رہے تھے کہ ایئر کنڈیشن آن کرو یہاں بہت گرمی ہے ،میں پہاڑ پر جاؤں گا ایسی باتیں تو رئیس لوگ کرتے ہیں۔''

وہ سوچنے لگا پھر مایوسی سے بولا۔

''جھونپڑی میں رہنے والے محلوں کے خواب دیکھتے ہیں شاید میں نے ایئر کنڈیشن کمرے کا خواب دیکھا تھا۔''

وہ سر ہلا کر بولی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو میں بھی اکثر خیال ہی خیال میں پہاڑوں پر گرمیاں گزارنے جاتی ہوں غریبی ہمارا مقدر ہے پھر بھی ہم اپنے خیالوں کے رئیس ہیں ویسے تم نے بڑبڑانے کے دوران ایک عجیب بات کہی تھی مجھے سن کر بڑی ہنسی آئی۔''

''کیا کہا تھا میں نے؟''

''تم نے کہا تھا دیکھو ،وہ دیکھو وہ کالے بادلوں سے پھول جھانک رہا ہے'' یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی ''کالے بادلوں سے چاند اور سورج نظر آتے ہیں لیکن تمہیں پھول نظر آ رہا تھا یہ کتنی عجیب سی......''

وہ کہتے کہتے رک گئی پھر سوچ کر بولی۔

''کہیں تم شاعر تو نہیں ہو شاعر لوگ اکثر ایسی بے تکی باتیں کرتے ہیں''

''پتا نہیں میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں سوچتا ہوں تو سرُ دکھنے لگتا ہے '' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

نرس نے اسے ہمدردی سے دیکھا پھر دوا کا گلاس اٹھا کر وہاں سے چلی گئی ۔

دیوار گھڑی کی ٹن ٹن سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں' دن کے دو بجے تھے عیادت کے لیے آنے والوں کے لیے ابھی دو گھنٹے کی دیر تھی وہ بے چینی سے وقت کا انتظار کر رہا تھا اسے یقین تھا کہ وہ آئے گی وہ جو بار بار پلٹ کر دیکھتی ہے اس کا چہرہ اسے سوچنے پر مجبور کرتا تھا وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے، زندگی کے کسی موڑ پر وہ ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔

پھر اسے ہسپتال کے چکنے فرش پر اونچی ایڑی کی کھٹ پٹ سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا ایک نوجوان لڑکی عیادت کے وقت سے پہلے ہی کسی مریض سے ملنے آئی تھی یہ وہ نہیں تھی جس کا اسے انتظار تھا لیکن جب وہ مریض کے بیڈ کے دوسری طرف گھوم کر رہ گئی تو اس کے بالوں میں ایک مسکراتے ہوئے پھول کو دیکھ کر اچانک ہی اس کے سوئے ہوئے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ پھول اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

اس پھول کو وہ یاد کر رہا تھا جیسے بچہ اپنے بھولے ہوئے سبق کو کہیں کہیں سے یاد کرتا ہے اور بھول بھول جاتا ہے۔

ہر کام کے لیے ایک گہری لگن کی ضرورت ہوتی ہے وہ اپنے نام کو اتنی لگن سے یاد نہ کر سکا تھا جتنی گہری

وابستگی سے اس پھول کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے کالے بادلوں سے جھانکتے ہوئے پھول کا ذکر ہوا تھا اب وہ کالی زلفیں وہ پھول اور ریشم کا چہرہ تینوں چیزیں گڈمڈ ہو رہی تھیں لیکن پچھلی شام اس نے ریشم کے بالوں میں پھول نہیں دیکھا تھا اس لیے اس کی یادداشت ٹھوکریں کھا رہی تھی' وہ پھول ریشم کی زلفوں تک آتے آتے کالے بادلوں میں گم ہو جاتا تھا۔

لڑکی مریض کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی وہ شہریار سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے اور اس پھول سے اس کا گہرا تعلق تھا ،نہیں ،لڑکی سے نہیں ،صرف پھول سے ایک انجانا رشتہ ہے کیونکہ دل ،دماغ اور نظریں سب ہی پھول پر مرکوز ہیں لڑکی سے کوئی تعلق ہوتا تو نگاہیں اس کے چہرے پر ضرور منڈلاتیں۔

وہ لڑکی ذرا دیر کے لیے آئی تھی پھر وہاں سے جانے لگی۔

وہ بستر سے اتر کر اپنی چپل پہننے لگا' کمبل سے باہر آتے ہی اسے سردی محسوس ہونے لگی بخار کی وجہ سے کچھ کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی' اس نے کمبل اٹھا کر اپنے جسم کے اطراف اچھی طرح لپیٹ لیا لڑکی دوسرے دروازے سے باہر جا رہی تھی۔

اور جب وہ پھول کے پیچھے جانے لگا تو اسے یوں لگا جیسے وہ پہلے بھی اس پھول کے پیچھے چلتا رہا ہے پہلے بھی وہ پھول لگائے آگے آگے جا رہی تھی اور وہ پیچھے پیچھے چل رہا تھا ہاں ایسا کبھی ہو چکا ہے۔

نرس نے شہریار کو باہر جاتے دیکھا تو سمجھی کہ وہ ٹائیلٹ کی طرف جا رہا ہے اس لیے وہ دوسرے مریض کی جانب چلی گئی۔

وہ ہسپتال کے برآمدے سے چلتا ہوا باہر آیا پھول والی ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر جا رہی تھی شہریار کو اپنے وارڈ میں واپس آ جانا چاہیے تھا' پھول اسے مقناطیس کی طرح کھینچ رہا تھا' ذہن کے تاریک آسمان پر وہ پھول ایک ستارے کی طرح ٹمٹما رہا تھا اور وہ اس ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں ایک دھندلائے ہوئے راستہ پر بڑھتا جا رہا تھا۔

جب وہ ہسپتال کے احاطہ سے باہر سڑک کے کنارے آیا تو پھول والی سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ

گئی تھی اور آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔

وہ دونوں ایک ندی کے دو کنارے بن گئے وہ اس کنارے چل رہی تھی یہ اس کنارے چل رہا تھا اس کے دماغ کے اندر بیٹھا کوئی کہہ رہا تھا کہ ایسا پہلے بھی ہو چکا ہے زندگی کا ایسا ہی کوئی راستہ تھا جس کے دوسرے کنارے ایک پھول اشارے کی طرح پکارتا جا رہا تھا آہ! وہ راستہ مل گیا مگر منزل نہیں مل رہی تھی۔

ان کے درمیان وہ راستہ ایک ندی کی طرح گزرتا رہا کبھی بل کھاتا رہا ،کبھی مڑتا رہا کبھی دوسرے تیسرے راستے سے مل کر اپنا رخ بدلتا رہا پھر اس کے پھول کے قریب ایک کار آ کر رک گئی شہریار کے قدم بھی رک گئے۔

وہ کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی اس کے بیٹھتے ہی پھول نظروں سے اوجھل ہو گیا کار دوبارہ اسٹارٹ ہوئی اور ایک زناٹے سے آگے بڑھتی ہوئی نظروں سے دور ہونے لگی۔

اب اس کے سامنے ٹریفک کا شور تھا' لوگوں کی بھیڑ تھی' مردوں کے قہقہے اور عورتوں کے رنگین آنچل لہرا رہے تھے لیکن وہ پھول نہیں تھا۔

اسے تھکن کا احساس ہونے لگا بخار کی حالت میں نہ جانے وہ کتنی دور تک اور کتنی دیر تک چلتا رہا تھا اس کے پاؤں نقاہت سے کانپ رہے تھے اس نے پیچھے کی جانب پلٹ کر دیکھا بہت سے راستے درخت کی شاخوں کی طرح مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔وہ پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ کون سا راستہ اسے یہاں تک لایا ہے۔

وہ واپس آہستہ آہستہ چلنے لگا سامنے چوراہے پر کھڑے ہوئے سپاہی کے قریب آ کر بولا۔

''ہسپتال کا راستہ کون سا ہے؟۔''

''کون سا ہسپتال ...۔یہاں تو کتنے ہی ہسپتال ہیں۔''

''میں خیراتی ہسپتال کا راستہ پوچھ رہا ہوں۔''

''کون سا خیراتی ہسپتال۔نام بتاؤ۔''

وہ نام نہیں جانتا تھا اتنے دنوں تک وہاں زیر علاج رہنے کے باوجود کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ

ڈاکٹر نرس یا کسی مریض سے ہی ہسپتال کا نام معلوم کرے وہ تو صرف اپنے آپ کو پہچاننے کی کوششیں کرتا رہا تھا۔

اس نے سپاہی کو مایوسی سے دیکھا اس کے بعد سر جھکا کر آگے بڑھنے لگا اب بخار تیز ہو رہا تھا سردی سے بدن کپکپا رہا تھا وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر قدم لڑکھڑاتے جا رہے تھے آخر وہ کسی منزل کی آس پر آگے بڑھتا اس کا کوئی گھر نہیں تھا اسپتال کا راستہ اس کے حافظے سے مٹ گیا تھا مایوسی، تھکن اور کمزوری سے نڈھال ہو کر وہ ایک دکان کی دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔

پھر وہ کمبل میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ دیوار کے سہارے یوں بیٹھنے لگا جیسے کسی گہری پانی میں ڈوبتا جا رہا ہو۔



''شہریار'' ! بیگم بشارت چیختی ہوئی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اور وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگیں۔

ان کی چیخ سن کر زینب آپا اور وقار علی دوڑتے ہوئے کمرے میں آ گئے زینب آپا نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیا ہوا۔ خیریت تو ہے۔ ابھی ہم نے تمہاری چیخ سنی ہے۔'' بیگم بشارت تھوڑی دیر تک انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

''میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے میں نے دیکھا کہ میرا شہریار بلندی سے پستی کی طرف گرتا جا رہا ہے' یا اللہ خیر ہو میرے بچے پر پاک پنجتن کا سایہ رہے وہ خیریت سے واپس آ جائے تو میں مشکل کشا کے نام سے دیگ چڑھاؤں گی۔''

زینب آپا نے ان کے شانہ کو تھپک کر تسلی دی ۔

''شہریار بخیریت واپس آئے گا تم خواب دیکھ کر خوامخواہ ہی پریشان ہو رہی ہو بے وقت سونے سے ایسے ہی اوٹ پٹانگ خواب نظر آتے ہیں دیکھو شام ہو رہی ہے چلو اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو میں ملازمہ سے

چائے لانے کے لیے کہتی ہوں۔''

بیگم بشارت بڑبڑاتی ہوئی پلنگ سے اتر کر غسل خانہ کی طرف جانے لگیں۔

''اس لڑکے کو میری پریشانیوں کا ذرا احساس نہیں ہے دو ہفتے گزر گئے ہیں لیکن ابھی تک اسے خیریت کا ایک خط لکھنے کی فرصت نہیں ملی ہے۔'' وقار علی نے کہا۔

''وہ کاروبار کے سلسلہ میں گیا ہے یقیناً مصروف ہوگا میں آج ہی منیجر سے اس کا پتہ لے کر خط لکھتا ہوں۔''

وہ غسل خانے میں چلی گئیں وقار علی اپنی بیگم سے باتیں کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

آدھے گھنٹہ بعد وہ سب پھر ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہو گئے' ملازم نے چائے کی ٹرے لاکر ان کے درمیان رکھ دی' بیگم بشارت نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

''رقیہ اور بچے کہاں ہیں۔''

زینب آپا نے ناگواری سے کہا۔

''اپنے میکے گئی ہے نصیب سے ایسی بہو ملی ہے کہ سسرال میں اس کے پاؤں نہیں ٹکتے ان دو ہفتوں میں وہ سات بار اپنے میکے جا چکی ہے نہ جانے وہاں کون سا خزانہ چھپا رکھا ہے کہ اسے دیکھے بغیر بہو بیگم کو نیند ہی نہیں آتی۔''

وقار علی نے کہا۔

''جانے بھی دو بیگم! ہمیں بیٹے سے کون سا سکھ مل گیا ہے کہ ہم بہو سے کسی خدمت گزاری کی توقع کریں۔''

اسی وقت ایک ملازم نے باہر سے آ کر کہا۔

''بیگم صاحبہ! پبلشر جبار صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ میرے بیٹے نے ناول لکھنا چھوڑ دیا ہے وہ کوئی دوسرا دروازہ دیکھیں۔''

''بیگم صاحبہ ! وہ چھوٹے صاحب سے نہیں ، آپ سے ملنا چاہتے ہیں کہتے ہیں کہ بہت ضروری کام ہے۔''

وہ بیزار ہو کر بولیں۔

''کیا مصیبت ہے مجھ سے ضروری کام کیا ہوسکتا ہے۔ جاؤ ، انہیں یہاں بھیج دو۔''

ملازم چلا گیا' وقار علی نے کہا۔

''ہاں میں نے سنا تھا کہ شہر یار کا کوئی ناول شائع ہوا ہے۔''

''کیا خاک شائع ہوا ہے نہ جانے اس لڑکے کو فضول کہانیاں لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہو گیا ہے اچھا ہوا کہ جرمنی چلا گیا ہے وہاں جا کر اپنی مصروفیتوں میں اس شوق کو بھول جائے گا۔'' دروازے پر سے جبار صدیقی کی آواز آئی۔

''اجی بیگم صاحبہ ! بھولنے کو تو وہ ایسے بھولا ہے کہ اپنی پچھلی تمام زندگی کو بھلا بیٹھا ہے' یعنی اپنے ماضی کے ساتھ ساتھ میرے نقصان کو بھی بھول گیا ہے اب یہ میرا نقصان کون پورا کرے گا؟۔''

وقار علی نے کہا۔

''آپ کیا فرما رہے ہیں ۔ یہاں تشریف لائیے اور یہ بتائیے کہ آپ کس کے متعلق یہ باتیں کہہ رہے ہیں۔'' اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''میں شہر یار کے متعلق کہہ رہا ہوں وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے اور حاجی احمد دین کے خیراتی ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔''

بیگم بشارت نے بگڑ کر کہا۔

''آپ کے منہ میں خاک ، خدا نہ کرے کہ میرا بیٹا کسی خیراتی ہسپتال میں جائے وہ تو جرمنی گیا ہوا ہے۔''

جبار صدیقی نے اپنی جیب سے تہہ کیا ہوا اخباری صفحہ نکال کر کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں نے آج کا اخبار نہیں دیکھا ہے یہ دیکھیے اور آپ اپنے بیٹے کو

پہچانئے۔''

اس نے اخبار کا صفحہ کھول کر سامنے کر دیا۔ بیٹے کی تصویر دیکھتے ہی بیگم بشارت کا کلیجہ دھک سے رہ گیا' انہوں نے جھپٹ کر اس صفحہ کو ہاتھوں میں لیا اور بیٹے کے متعلق شائع ہونے والی خبر کو پڑھنے لگیں زینب آپا اور وقار علی بھی ان کے آس پاس آ کر بیٹھ گئے تھے اور حیرانی سے منہ کھولے بڑی خاموشی سے اس خبر کو پڑھتے جا رہے تھے۔

پھر بیگم بشارت اپنے سینے پر دو تھپڑ مار کر چیخنے لگیں۔

''ہائے میرا بچہ ،میرا بچہ لاوارثوں کی طرح اسپتال میں پڑا ہے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی وقار بھائی جلدی سے کار نکالیے میں ابھی وہاں جاؤں گی اخبار میں لکھا ہے کہ وہ سب کچھ بھول گیا ہے اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا مگر ،مگر مجھے پہچان لے گا میں اسے جنم دینے والی ماں ہوں میں نے اسے دودھ پلایا ہے مجھے کیسے نہیں پہچانے گا ضرور پہچانے گا۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر وقار علی کے ساتھ باہر جانے لگیں زینب آپا بھی ان کے پیچھے ہو گئیں۔

جبار صدیقی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''بیگم صاحبہ ! مجھے بھی ساتھ لے چلیے شاید مجھے دیکھ کر اسے نقصان یاد آ جائے اور ضرور یاد آ جائے گا یہ رقم معمولی نہیں ہوتی خواب میں بھی یاد آتی رہتی ہے۔''

وہ بڑبڑاتا ہوا ان کے پیچھے ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆☆

ریشم کالج کے لائبریری ہال میں آئی تو وہاں شہریار گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ چند لڑکیاں ایک میز کے اطراف بیٹھی ہوئی تھی اور اخبار میں شائع ہونے والی تصویر کو ایک دوسرے کے ہاتھوں سے لے کر دیکھ رہی تھیں۔

اس کی کلاس فیلو تبسم نے اسے دیکھتے ہی آواز دی۔

''ریشم! ادھر آؤ اس تصویر کو دیکھو یہ تو وہی نوجوان ہے۔''

ریشم اس کے قریب آئی صفیہ تبسم کے ہاتھوں میں اخبار کا وہ صفحہ کھلا ہوا تھا شہریار کی تصویر دیکھتے ہی وہ ٹھٹھک گئی پھر اس کے ہاتھوں سے اخبار لے کر پڑھنے لگی۔

پڑھنا کیا تھا۔ وہ تو سب کچھ جانتی تھی پھر بھی پڑھنے کے بہانے تصویر پر نظریں جمائے اپنی سہیلی کے پاس بیٹھ گئی اس تصویر نے پھر سے دل میں ہلچل سی مچا دی تھی اس ہلچل کو سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیوں سے چھپانے کے لیے وہ تھوڑی سی مہلت چاہتی تھی اس لیے اس صفحہ کو چہرے کے سامنے رکھے خود کو پردے میں چھپا رہی تھی۔

صفیہ تبسم نے کہا۔

''تم نے پہچانا یہ وہی نوجوان ہے ناں۔ اس روز کالج گیٹ کے سامنے تم اس کی کار تلے آتے آتے بچ گئی تھیں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''ہاں وہی معلوم ہوتا ہے۔''

''معلوم کیا ہوتا ہے۔ بالکل وہی ہے بے چارہ اپنے پرائے کو بھول چکا ہے سوچو تو اس کی تنہائی کتنی رومانٹک لگتی ہے اس وقت جو بھی اسے اپنائے گا ، یہ اسی کا ہو جائے گا۔''

ایک لڑکی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہائے اس طرح تو کوئی بھی لڑکی اسے بھگا کر لے جا سکتی ہے۔''

تمام لڑکیاں اس بات پر قہقہے لگانے لگیں۔

ریشم کو اس لڑکی کی بات بہت بری لگی اس نے کتنا سستا مذاق کیا تھا اور لڑکیاں تھیں کہ قہقہے لگا کر اسے داد دے رہی تھیں۔

وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگی صفیہ تبسم بھی اس کے ساتھ ہو گئی لائبریری سے باہر آ کر صفیہ نے کہا۔

'' کاش کہ میں اس کے کسی کام آسکتی نہ جانے وہ گمنام اجنبی کون ہے اگر اس روز تم اس کی کار کا نمبر یاد کر لیتیں تو بڑی آسانی سے ہمیں اس کے گھر کا پتا معلوم ہو جاتا ویسے وہ کوئی رئیس زادہ ہے اس کے رشتہ دار اخبار دیکھ کر ہسپتال پہنچ جائیں گے۔''

ریشم نے کہا۔ ''کوئی ضروری تو نہیں کہ وہ رئیس زادہ ہو بہت سے لوگ لنڈے بازار کا سوٹ پہن کر اور دوستوں کی کاریں چلا کر خود کو رئیس ظاہر کرتے ہیں۔''

''پلیز ریشم اس کے متعلق ایسی رائے قائم نہ کرو یہ سوچو کہ اس بیچارے کی یادداشت کیسے واپس آسکتی ہے۔''

''ہمارے سوچنے سے کیا ہوگا۔ کسی ماہر نفسیات کو سوچنا چاہیے۔''

''ہمدردی کی خاطر کیا ہم نہیں سوچ سکتے۔ مگر تم تو بیزاری ظاہر کر رہی ہو حالانکہ اس بے چارے نے تمہاری جان بچائی ہے تم غلطی سے بیچ سڑک پر آگئی تھیں اگر وہ فورا" ہی بریک نہ لگاتا تو اس وقت تم ہسپتال میں نظر آتیں۔''

''میں تمہاری اس بات کو تسلیم کرتی ہوں لیکن یہ تو سوچو کہ اگر ہم نے اس سے ہمدردی کی تو خواہ مخواہ بدنامی گلے پڑے گی راشدہ جیسی لڑکیاں فوراً ہی ہمارے متعلق اسکینڈل بنا دیں گی۔''

صفیہ نے قائل ہو کر کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو میں راشدہ کو بھول گئی تھی بہت وہ بدمعاش ہے منٹوں میں ہمیں بدنام کر دے گی۔''

ریشم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''اب تمہاری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے تو میں تمہیں بتا دیتی ہوں کل میں اس اجنبی کو ہسپتال میں دیکھ چکی ہوں۔''

''سچ۔ ''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں میرے بڑے بھائی جان اس وارڈ کے بارہ نمبر بیڈ پر ہیں' میں ان سے ملنے گئی تو اس اجنبی سے سامنا ہو گیا وہ مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔''

صفیہ اس کا بازو پکڑ کر جوشیلے انداز میں بولی۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کے لیے بالکل اجنبی نہیں ہو سب کچھ بھولنے کے بعد تم اسے جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔ ریشم تم چاہو تو اسے یاد دلا سکتی ہو کہ اس نے ایک بار تمہاری جان بچائی تھی۔ اسے ایک بھولا ہوا واقعہ یاد آئے گا تو اسی نوعیت کے دوسرے واقعات بھی یاد آتے جائیں گے۔''

ریشم سر جھکا کر بولی۔

''یہی تو میں نہیں چاہتی کہ اسے ایک کے بعد دوسرا واقعہ یاد آئے۔''

صفیہ نے چونک کر پوچھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا ایسی کوئی بات ہے جسے تم یاد نہیں دلانا چاہتیں۔''

''ہاں، میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی تم میری بہت اچھی سہیلی ہو یہ اس دن کی بات ہے جس دن میں اس کی کار کے سامنے آ گئی تھی تم تو ثمینہ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی تھیں میں وہاں بھائی جان کا انتظار کر رہی تھی وہ اپنی کار سے اتر کر میرے پاس آیا اور میرے بالوں میں لگے ہوئے پھول کو مانگنے لگا۔''

''اچھا''! صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم نے پھول دے دیا۔''

''نہیں، میں بھلا کیسے دے دیتی میں نے انکار کر دیا وہ بھی سمجھ گیا کہ اگر وہ مجھ سے پھول لے گیا تو اس کے دوست مجھے ایک سستے خیال کی لڑکی سمجھیں گے اس وقت اس نے میرے انکار کو اہمیت دی لیکن جاتے جاتے چیلنج کر گیا کہ وہ جس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے ضرور حاصل کرتا ہے اور وہ ایک دن میرے ہاتھوں سے اک پھول لے کر رہے گا۔''

''اب تم ہی بتاؤ میں یہ باتیں اسے کیسے یاد دلا سکتی ہوں۔ میں کس لیے اسے یاد دلاؤں کہ وہ میرے سامنے ایک ضد کر بیٹھا ہے۔ میں کیوں کر اس کی ضد پوری کروں۔ وہ میرا کون ہوتا ہے۔''

صفیہ فورا" ہی کوئی جواب نہ دے سکی وہ ریشم کے ساتھ چلتی ہوئی اپنی کار کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی پھر اس نے کہا۔

''تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اسے پسند نہیں کرتی ہو۔''

''اس میں پسند یا ناپسند کی کیا بات ہے۔''

''اچھا تو کیا پسند کرتی ہو۔''

وہ گھبرا کر بولی۔

''آں نن نہیں تو تم کہاں کی بات ، کہاں لے جا رہی ہو تم سمجھتیں کیوں نہیں کہ میں اسپتال میں ڈاکٹر اور پولیس آفیسر کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں اسے کس طرح جانتی ہوں۔ کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ وہ پھول والی بات بھی ظاہر ہو جائے گی۔ نہیں صفیہ ! میں سب کے سامنے تماشا نہیں بننا چاہتی میں ، میں اب بڑے بھائی جان سے ملنے بھی نہیں جاؤں گی مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ اجنبی مجھے پہچان نہ لے۔''

''اور ، اور سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ میں نے بالوں میں پھول لگانا چھوڑ دیا ہے۔''

صفیہ نے چونک کر اس کے بالوں کو دیکھا ایک پھول کے بغیر ریشمی زلفوں کا سنگار اجڑ گیا تھا اور وہ پھیکی پھیکی سی نظر آ رہی تھی صفیہ کو یوں لگا جیسے اس نے پھول کو نہیں ، اپنے کسی چور جذبہ کو کہیں چھپا کر رکھ دیا ہے۔



ایک ٹیکسی اسپتال کے سامنے آ کر رک گئی اس کی پچھلی سیٹ پر نثار کی بیوی رقیہ اور اس کی بھابی جمیلہ بیٹھی ہوئی تھیں اگلی سیٹ پر رقیہ کا بھائی جلال بیٹھا ہوا تھا وہ تینوں ٹیکسی سے اتر کر فٹ پاتھ پر آ گئے رقیہ نے اپنے بھائی سے کہا۔

''جلال ! تم تمام باتیں اچھی طرح سمجھ گئے ہو ناں۔ کوئی غلطی تو نہیں کرو گے۔''

''میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اسپتال والوں کو اور پولیس والوں کو ایسا چکر دوں گا کہ سب چکرا کر رہ جائیں گے۔''

رقیہ نے اپنی بھابی سے پوچھا۔

''اور بھابھی تم کیا کرو گی؟''

''میں تو جاتے ہی شہر یار سے لپٹ کر رونا شروع کردوں گی تم تو جانتی ہو کہ جب میں مجلسوں میں رونا شروع کرتی ہوں تو تمام عورتیں ماتم کرنا بھول جاتی ہیں میرا رونا دیکھ کر ہسپتال والے یقین کرلیں گے کہ شہر یار میرا سگا دیور ہے۔''

''ٹھیک ہے تم دونوں جاؤ میں یہاں ٹیکسی میں بیٹھی تمہارا انتظار کروں گی۔''

وہ دونوں آگے بڑھتے ہوئے ہسپتال کے احاطہ میں داخل ہوگئے۔ ایک وارڈ بوائے تیزی سے گیٹ کی طرف جا رہا تھا جلال نے اسے روک کر پوچھا۔

''دو نمبر وارڈ کہاں ہے۔ ''اس نے جواب دیا۔

''اجی صاحب! دو نمبر وارڈ تو اپنی جگہ ہے مگر اس وارڈ کا مرض کہیں بھاگ گیا ہے ہم بہت دیر سے اسے تلاش کر رہے ہیں کیا آپ نے اسے کہیں دیکھا ہے اس کے سر کے پیچھے کراس پٹی ہے وہ دماغی مریض ہے اپنے آپ کو بھول گیا ہے آج اخبار میں اس کی تصویر بھی شائع ہو چکی ہے۔'' جمیلہ اپنا سینہ پیٹ کر کہنے لگی۔

''ہائے میرا سلیم کہاں چلا گیا۔ ہم تو اسے لینے آئے ہیں اب میں کس سے لپٹ کر روؤں گی۔'' جلال نے وارڈ بوائے سے کہا۔

''وہ میرا بھائی ہے اس کا نام سلیم ہے اب ہم اس کہاں تلاش کریں۔ ''

وارڈ بوائے نے کہا۔

''اس کا نام سلیم نہیں شہر یار ہے وارڈ نمبر دو میں ایک بیگم صاحبہ آئی ہیں وہ کہتی ہیں کہ شہر یار ان کا بیٹا ہے آپ کہتے ہیں کہ سلیم ہے اور آپ کا بھائی ہے۔''

جمیلہ اور جلال گھبرا کر ایک دوسرے کو تکنے لگے وہ سمجھ گئے کہ بیگم بشارت ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئی ہیں اگر اب وہ بھی اسپتال کے اندر جائیں گے تو ان کا جھوٹ کھل جائے گا اس نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

''وہ شہر یار نہیں سلیم ہے میرا بھائی ہے نہ جانے وہ یہاں سے نکل کر کہاں بھٹکتا ہوگا چلو بیگم ہم اسے تلاش کریں گے اب اس اسپتال میں ہمارے لیے کچھ نہیں ہے۔''

وہ جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا تیزی سے چلتا ہوا ہسپتال کے احاطہ سے باہر آ گیا۔

رقیہ نے انہیں دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے اتنی جلدی واپس کیوں آ گئے۔'' جلال نے قریب آ کر کہا۔

''کچھ نہ پوچھو ہم ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے ہیں شہر یار کی امی ہم سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئی ہیں خدا کا شکر ہے کہ ان کا سامنا نہیں ہوا چلو یہاں سے بھاگ چلو۔''

وہ دونوں ٹکسی میں بیٹھنے لگے رقیہ نے مایوس ہو کر کہا۔

''اتنی دوڑ دھوپ کے بعد بھی ناکامی ہوئی آخر ماں اپنے بیٹے کے پاس پہنچ ہی گئی'' جلال نے کہا

''پہنچنے سے کیا ہوتا ہے بیٹا نہیں ملا وہ اسپتال سے بھاگ گیا ہے۔''

رقیہ کے چہر پر رونق آ گئی۔

''بھاگ گیا ہے۔اسپتال سے کیسے بھاگ گیا ہے۔''

''پتہ نہیں ہسپتال کے ملازم اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''اوہ پھر تو ہمیں بھی تلاش کرنا چاہیے ہوسکتا ہے کہ اسپتال سے نکلنے کے بعد وہ راستہ بھول گیا ہو اور کہیں بھٹک رہا ہو' اس سے پہلے کہ پولیس اسے ڈھونڈ کر خالہ جان تک پہنچائے ہم اس تلاش کر کے اس شہر سے دور لے جائیں گے ڈرائیور چلو گاڑی آگے بڑھاؤ ''ڈرائیور نے کہا۔

''بیگم صاحبہ ! میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس اسپتال میں میرا ایک بھائی بیمار ہے میں اس سے ملنے جاؤں گا آپ کوئی دوسری ٹیکسی لے لیجیے۔'' جلال نے کہا۔

''اب ہم دوسری ٹیکسی کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کر سکتے تمہارا بھائی اسپتال میں ہے تم کسی دوسرے وقت جا کر مل سکتے ہو مگر میرا بھائی اسپتال سے بھاگ گیا ہے اسے ابھی تلاش کرنا ضروری ہے۔''

ڈرائیور نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''میرا نام ایمان علی ہے۔میں بے ایمانی کی باتیں جلدی سمجھ لیتا ہوں وہ تمہارا بھائی نہیں ہے تم لوگ کسی لمبے چکر میں ہو۔''

جلال نے غصہ سے کہا۔

''ہم کسی بھی چکر میں ہیں تم سے مطلب۔تم اپنے فائدے کو دیکھو تمہیں میٹر سے زیادہ کرایہ ملے گا۔''

''کتنا ملے گا۔''

رقیہ نے جلدی سے کہا۔

''ہم پچاس روپے زیادہ دیں گے تم دیر نہ کرو جلدی چلو ''ایمان علی نے کہا۔

''گاڑی جلدی چلے گی تو راستے میں بھٹکنے والا آپ کا آدمی تیزی سے گزر جائے گا اور ہمیں نظر نہیں آئے گا اس لیے گاڑی آہستہ چلانی ہوگی اور گاڑی آہستہ چلانے سے پٹرول زیادہ خرچ ہوتا ہے اس لیے پٹرول کے پیسے الگ لوں گا۔''

''لے لینا تم گاڑی چلاؤ ''اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اس آدمی کا حلیہ بتاؤ میری نظریں بہت تیز ہیں' ایک ٹیکسی ڈرائیور گاڑی چلاتے وقت چاروں طرف نظر رکھتا ہے۔''

رقیہ نے کہا۔

''اگر تم نے اسے تلاش کرلیا تو ہم اور زیادہ انعام دیں گے' جلال اسے شہر یار کی تصویر دکھاؤ۔''

جلال نے جیب سے اخبار کا تہہ کیا ہوا صفحہ نکال کر اسے کھولا اور اس کی جانب بڑھا دیا۔

ایمان علی اس صفحہ کو اسٹیرنگ پر رکھ کر شہر یار کی تصویر کو دیکھتے ہوئے ڈرائیو کرنے لگا وہ کبھی تصویر کو دیکھ رہا تھا اور کبھی ونڈ اسکرین کے پار راستے کو دیکھتا جا رہا تھا پھر اس نے اخبار کا صفحہ واپس کرتے ہوئے کہا۔

''ہم اسے تلاش کر رہے ہیں مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ابھی مل جائے اگر یہ مجھے بعد میں کبھی مل جائے تو بتایئے اسے کس پتہ پر پہنچادوں۔''

رقیہ اور جلال سوچنے لگے۔

جلال اسے اسپتال سے اپنے گھر نہیں لانا چاہتا تھا اسے اس بات کا ڈر تھا کہ محلے پڑوس والے شہر یار کو پہچان لیں گے وہ تو اسے لے کر سیدھا مظفر آباد جانا چاہتا تھا بیگم بشارت یا پولیس والے کبھی سوچ بھی نہیں

سکتے تھے کہ کوئی اس کو اتنی دور لے گیا ہے اور اب تو شہر یار خود ہی ہسپتال سے بھاگ گیا تھا اگر وہ ہاتھ لگ جاتا تو کسی کو ان پر شبہ نہ ہوتا رقیہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''اگر وہ تمہیں کہیں مل جائے تو کیا تم اسے دو چار گھنٹے کے لیے کہیں چھپا سکتے ہو۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں تو تمام عمر اسے چھپا کر رکھ سکتا ہوں بس چھپانے کا کرایہ ملتے رہنا چاہیے۔''

''مل جائے گا '' رقیہ نے کہا۔ ''تم اسے کہیں چھپا کر ہوٹل شادمان کے نثار صاحب کو فون کرنا اور انہیں اپنا نام بتا کر کہیں ملنے کی جگہ مقرر کر لینا وہ تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔''

اس نے اسٹیرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''بس تو پھر اطمینان رکھیے، کل صبح تک میں اسے تلاش کر لوں گا۔''

رقیہ نے جلال سے کہا۔

''ایمان علی کو ہوٹل کا فون نمبر لکھ کر دے دو۔''

جلال جیب سے قلم اور نوٹ بک نکال کر فون کا نمبر لکھنے لگا۔

اس وقت گاڑی ٹھیک اس فٹ پاتھ کے قریب سے گزر رہی تھی ، جہاں شہر یار کمبل میں لپٹا ہوا پڑا تھا وہ سر سے پاؤں تک کمبل میں چھپا ہوا تھا ایمان علی نے اسے دیکھا لیکن فٹ پاتھ پر رہنے والا کوئی فقیر سمجھ کر گاڑی آگے بڑھاتا چلا گیا ۔

شہر یار کا بخار کم ہو گیا تھا وہ بے خبر سو رہا تھا ایسی گہری نیند کبھی فوم کے بستر پر بھی نہیں آئی تھی وہ غریبوں کی زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ کرنے نکلا تھا اور تقدیر اسے سچ مچ فٹ پاتھ کے پتھریلے بستر پر سلا رہی تھی۔

اگر وہ ہوش و حواس میں ہوتا اور اس کی یادداشت محفوظ ہوتی تو شاید وہ اتنا مہنگا تجربہ کبھی نہ کرتا خصوصا "ایسی بیماری اور کسمپرسی کی حالت میں اپنی دولت کا سہارا ضرور لیتا اس کی امی اسے کسی مہنگے ہسپتال کے مہنگے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں رکھ کر علاج کراتیں مگر اب وہ دولت اور آرام و آسائش کا خواب دیکھ سکتا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا رات گہری ہو چکی تھی اب وہاں ٹریفک کا

شور نہیں تھا بڑی بڑی دکانیں بند ہو چکی تھیں فٹ پاتھ پر ذرا دور ایک دودھ والا دکان کھولے بیٹھا تھا۔

اس چھوٹی سی دکان کی روشنی وہ دیکھ نہ سکا آنکھیں کھولنے کے باوجود وہ ابھی تک کمبل میں لپٹا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔

آہستہ آہستہ اسے یاد آنے لگا کہ وہ اسپتال سے نکل کر ایک پھول کے پیچھے چلتا ہوا یہاں آ گیا تھا اور نقاہت کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا پھر سوچتے سوچتے اس کا دھیان ہٹ گیا اپنے قریب اسے قدموں کی آوازیں سنائی دیں کسی نے کہا۔

''نو بج گئے ہم شام سے اسے تلاش کر رہے ہیں نہ جانے وہ کہاں گم ہو گیا ہے ہم اس طرح بھٹکتے رہیں گے تو وہ نہیں ملے گا۔''

کوئی عورت سسکیاں لینے لگی مرد کی آواز آئی۔

''ارے تم رو رہی ہو ہمت سے کام لو تمہارا بیٹا اس شہر میں ہے تمام تھانوں میں اس کی تصویر پہنچ گئی ہے پولیس اسے تلاش کر رہی ہے کل صبح تک وہ ضرور مل جائے گا۔''

اس عورت کی سسکیاں شہر یار کے دل کو چھو رہی تھیں، اس نے اپنے چہرے سے ذرا سا کمبل ہٹا کر دیکھا عورت کا چہرہ دکان سے آنے والی روشنی کی طرف نہیں تھا اس لیے وہ واضح طور سے نظر نہیں آ رہی تھی وہ بھی ایک دیوار کی آڑ میں پڑا ہوا تھا چہرے سے کمبل ہٹانے کے باوجود کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

عورت سسکتی ہوئی کہنے لگی۔

''یہ غریب سردی کے موسم میں کیسے فٹ پاتھ پر راتیں گزارتے ہیں میرے مولا! میرے بچے کو ایسے بے بس اور مجبور نہ کرنا نہیں تو ایک ماں کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔''

''تم کیسی باتیں کرتی ہو ہمارا شہر یار ایسا مجبور نہیں ہے اسے کسی اچھی جگہ پناہ مل گئی ہو گی اب گھر واپس چلو ہو سکتا ہے کسی تھانہ سے کوئی اطلاع آئی ہو۔''

شہر یار نے اس کی ممتا سے متاثر ہو کر سوچا۔ آہ! بے چاری اپنے بیٹے کو تلاش کر رہی ہے لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میں کسے تلاش کر رہا ہوں، اس کی تلاش کے بہت سے راستے ہیں میرے لیے کسی کو تلاش

کرنے کا ایک بھی راستہ نہیں ہے میں تو مجبور ہوں وہ مجبور نہیں ہے اے رونے والی ماں! خدا تجھے تیرے بیٹے سے ملائے۔

کار کا دروازہ بند ہو گیا پھر وہ کار اسٹارٹ ہوگئی اور آہستہ آہستہ رفتار بڑھاتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔

اس کے آس پاس گہرا سناٹا چھا گیا سرد ہوائیں سسکیاں لیتی ہوئی قریب سے گزر رہی تھیں اس کا گلا خشک ہونے لگا اسے پیاس لگ رہی تھی اس نے سر اٹھا کر دکان کی جانب دیکھا وہاں دو گاہک بیٹھے ہوئے دودھ پی رہے تھے۔

اسے پچاس روپے کے نوٹ کا خیال آیا جسے انسپکٹر نے اس کے تھیلے سے نکال کر دیا تھا اس نے فولڈ کی ہوئی آستین کو کھول کر دیکھا تو وہ نوٹ موجود تھا وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا اسے بے حد کمزوری محسوس ہو رہی تھی جب وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوا تو اس کا سر چکرانے لگا۔

وہ تھوڑی دیر تک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا ایک ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس اس پر سے گزرتی ہوئی چلی گئی پر وہ ٹیکسی دودھ کی دکان کے سامنے جا کر رکی اس کا دروازہ کھلا اور ڈرائیونگ سیٹ سے باہر آتے ہوئے ایمان علی نے کہا۔

''باؤ جی! آدھ سیر دودھ گرما گرم مکھن کی ایک ٹکیہ بھی ڈال دینا ہم غریبوں کی جان بنانے کے لیے یہی ایک ٹانک رہ گیا ہے۔''

شہریار آہستہ آہستہ ڈگمگاتے ہوئے دکان کی جانب بڑھنے لگا دکان اس سے تقریباً" بیس گز کے فاصلے پر تھی لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دکان اس سے ہر قدم پر دور ہوتی جا رہی ہے۔

وہ چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر پڑا۔

دکان کے لوگ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگے ایمان علی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''کون ہو بھائی کیا زیادہ پی لی ہے یا راکٹ سے شوق کرتے ہو۔''

وہ قریب آ کر اسے اٹھانے لگا' شہریار اس کے بازوؤں کا سہارا لے کر کراہتے ہوئے اٹھا تو دکان سے آنے والی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھتے ہی ایمان علی نے حیرت سے کہا۔

''تم ...ارے یہ تو واقع تم ہو یعنی کہ تم ہو۔'' دکاندار نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کون ہے یہ؟۔''

''اپنا یار ہے۔'' ایمان علی نے کہا۔'' بہت پرانا یار ہے' میں اسے تلاش کر رہا تھا اور یہ یہاں ٹھوکریں کھا رہا ہے' بے چارہ بیمار ہے ہلکا ہلکا بخار معلوم ہوتا ہے۔''

شہریار نے کراہتے ہوئے کہا۔

''پپ...... پانی مجھے پیاس لگ رہی ہے پانی دو۔''

''یار پانی بھی پیو اور دودھ بھی پیو مگر پہلے ٹیکسی میں چل کر آرام سے بیٹھو باؤ جی! ایک آدھ سیر اور اس میں بھی مکھن کی تکیہ ڈال دینا اپنے یار کو بھی ٹانک کی ضرورت ہے۔'' وہ اسے سہارا دے کر ٹیکسی کی طرف لے جانے لگا۔

☆☆☆☆

ریشم اپنی سہیلی کی شادی میں آئی تھی۔ دوسری طرف دولھے کے ساتھ باراتیوں میں شہباز اور اس کا ایک چمچہ آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ پہچان گئی کہ اس روز کالج گیٹ کے سامنے شہریار کے ساتھ یہی لوگ تھے اور پھول حاصل نہ کرنے کی وجہ سے شہریار کا مذاق اڑا رہے تھے۔

اب وہ انہی لوگوں سے معلوم کر سکتی تھی کہ شہریار کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ ان کے ذریعہ شہریار کے رشتہ داروں تک پہنچ کر انہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کسمپرسی کی حالت میں ایک خیراتی ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔

وہ اس گمنام اجنبی سے دور رہ کر بھی اس کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ لیکن ایک قباحت تھی۔ شہباز یا اس کے آدمی سے شہریار کے متعلق کچھ پوچھنے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ایک نوجوان میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اتنی گہری دلچسپی کہ اس کے گھر کا پتہ پوچھ رہی ہے۔

کم از کم شہباز تو یہی سوچتا۔

وہ الجھن میں پڑ گئی۔ شہریار سے ہمدردی کرنے کا ایک موقع ہاتھ آیا تھا لیکن وہ اس طرح ہمدردی کرنا چاہتی تھی کہ کوئی بھی بدنامی اس چھو کر نہ گزرے اور ایسا ناممکن نظر آ رہا تھا۔

پھر بھی وہ سوچتی رہی۔ اس کی سہیلی کا نکاح پڑھا دیا گیا کتنے ہی لوگ کھا پی کر رخصت ہو گئے پھر سہیلی بھی ڈولی میں بیٹھ کر رخصت ہونے لگی۔ اس وقت تک ریشم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح شہباز سے شہریار کا پتہ حاصل کرے۔

جب ڈولی جانے لگی تو شہباز کو بھی دولھے کے ساتھ رخصت ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ لڑکیوں کی بھیڑ میں ریشم کو دیکھ کر رک گیا۔

ریشم ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ شہباز نے مسکرا کر کہا۔

''معاف کیجیے۔ میں شہریار کی طرح بدتمیز نہیں ہوں کہ آپ سے جبراً پھول طلب کروں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور آپ کی عزت کرتا ہوں۔''

اس کی باتوں سے ریشم کو اتنا معلوم ہو گیا کہ پھول طلب کرنے والے اجنبی کا نام شہریار ہے۔ شہباز نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''کہیں آپ اس غلط فہمی میں مبتلا تو نہیں ہیں کہ شہریار کی اس آوارگی میں، میں بھی شریک تھا۔''

''نن نہیں!'' وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ ''آپ واقعی شریف آدمی نظر آتے ہیں۔ میں، میں اس بدتمیز کے ڈیڈی سے شکایت کرنا چاہتی ہیں۔ کیا آپ اس کی کوٹھی کا پتہ بتا سکتے ہیں۔''

اس نے جواب دیا۔

''اجی اس کا باپ تو مر چکا ہے۔ صرف ایک ماں ہے۔ اگر آپ شکایت کرنا چاہتی ہیں تو آئیے۔ میری کار حاضر ہے میں آپ کو وہاں تک پہنچا دوں گا۔''

''جی شکریہ ابھی میرے بھائی جان گاڑی لے کر آتے ہیں میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ برائے مہربانی اس کی کوٹھی کا پتہ یا فون نمبر بتا دیجیے۔ میں فون پر ہی اسے اور اس کی والدہ کو ہزار باتیں سناؤں گی۔''

''اس کا فون نمبر 5895564 ہے۔''

ریشم نے فون نمبر دہراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے کہا۔

''صرف شکریہ ادا کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر آپ مجھے شریف آدمی سمجھتی ہیں تو کل شام کو میرے

ساتھ ہوٹل شادمان میں چائے پیجیے۔ یہ ہوٹل اسی شہریار کا ہے۔ وہ آپ کو میرے ساتھ دیکھے گا تو جل جائے گا۔''

اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ شہریار کی موجودہ حالت سے واقف نہیں ہے۔ پھر ریشم کو کیا پڑی تھی کہ وہ کسی کے ساتھ ہوٹل میں چائے پی کر کس دوسرے کو جلاتی۔ اس کا کام بن گیا تھا۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

''اچھا کل شام کو پانچ بجے میں ہوٹل میں آ جاؤں گی۔ اب میں جاتی ہوں خدا حافظ۔''

وہ کوئی جواب سنے بغیر پلٹ گئی اور کوٹھی کے اندر جانے لگی۔ شہباز نے خوشی سے مگن ہو کر سیٹی بجاتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی اور تیزی سے ڈرائیو کرتا چلا گیا۔

ریشم کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس کا ارادہ تھا کہ ابھی شہریار کی والدہ سے فون پر باتیں کرے گی۔ مگر فون کے پاس اپنے سہیلی کے والدین کو دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ اب کل صبح صفیہ تبسم کے گھر جائے گی اور اس کے کمرے میں تنہا بیٹھ کر شہریار کی والدہ کو ان کے بیٹے کے متعلق اطلاع دے گی اور کسی پر ظاہر نہیں ہونے دے گی کہ یہ ہمدردی کرنے والی ریشم ہے۔

تھوڑی دیر بعد ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ اس کے بھائی جان اسے لینے آئے ہیں۔ وہ اپنی سہیلی کے والدین سے رخصت ہو کر باہر آ گئی۔

باہر گیٹ پر ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ایمان علی کی ٹیکسی تھی۔ ریشم دروازہ کھول کر اس کے پاس والی سیٹ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''بھائی جان! آپ کہاں رہ گئے تھے۔ سارے مہمان جا چکے ہیں۔ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔''

ایمان علی نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

''میری بہنا! ٹیکسی ڈرائیور سڑکوں کا شہنشاہ ہوتا ہے کبھی کسی کو کچل کر آگے بڑھ جاتا ہے اور کبھی کسی کچلے ہوئے انسان کو اٹھا کر ٹیکسی میں پناہ دے دیتا ہے ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو۔''

یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ریشم نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی پچھلی سیٹ پر کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ وہ حیرت سے بولی۔

''یہ کون ہے۔ اس طرح کیوں لیٹا ہوا ہے۔''

''بے چارہ بیمار ہے۔''

''مگر یہ ہے کون؟۔''

''میرا ایک پرانا دوست ہے۔ فٹ پاتھ پر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اچانک مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ اب اسے بیماری کی حالت میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس لیے ساتھ لے آیا۔''

ریشم نے دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی ہوئی سوچنے لگی۔ اس کا بھائی نہیں جانتا تھا کہ جوان بہن کیا سوچ رہی ہے اور بہن نہیں جانتی تھی کہ اس کا بھائی کس بیمار کو اس کا ہم سفر بنائے لیے جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایمان علی نے پوچھا۔

''تمہاری سہیلی ڈولی میں بیٹھ گئی۔''

وہ خیالات سے چونک کر بولی۔

''جی کیا کہا آپ نے؟۔''

ایمان علی نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر سامنے راستے کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ نہ جانے کب تمہاری تعلیم ختم ہوگی اور کب تمہیں ڈولی میں بٹھا کر رخصت کروں گا۔''

وہ سر جھٹک کر بولی۔

''میں کیا آپ پر بوجھ بن گئی ہوں۔''

''نہیں ریشم ! میرا بس چلے تو تمہیں کبھی خود سے الگ نہ کروں۔ اس دنیا میں تمہارے سوا اور میرا کون ہے۔ ایک بڑے بھائی جان ہیں۔ وہ بھی بھابی کے کہنے میں آ کر ہم سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔''

ریشم نے اس کے شانے پر سر ٹیک دیا۔ پھر ہولے سے بولی ۔

''بھائی جان ! آپ میرے لیے اتنا کیوں سوچتے ہیں۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''اچھا جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

اس نے ایک گہری سانس کھینچ کر پوچھا۔''یہ تم نے بالوں میں کون سا تیل لگایا ہوا ہے۔''

''وہی جو آپ نے پچھلے ہفتہ لا کر دیا تھا۔''

''ارے ہاں۔ایک بات میں کئی دن سے پوچھنا چاہتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں۔تم نے بالوں میں پھول لگانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟۔''

ایک ساعت کے لیے ریشم کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی پھر وہ سنبھل کر بولی۔

''بس یونہی مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''واہ ،اچھا کیوں نہیں لگتا۔پھول لگا کر آئینہ میں ایک بھائی کی نظر سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ تم کتنی پیاری پیاری سی بہن لگتی ہو۔''

''کیا پھول کے بغیر میں بہن نہیں لگتی ؟۔''

ایمان علی کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ریشم نے پوچھا۔

''خاموش کیوں ہو گئے۔ جواب دیجیے۔''

وہ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولا۔

''آدھے گھنٹے کے بعد جواب دوں گا۔''

''میں نے کون سا مشکل سوال کیا ہے کہ آپ آدھے گھنٹے تک جواب سوچتے رہو گے۔''

اس نے سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے گاڑی روک دی اور کہا۔

''لو گھر آ گیا۔تم جلدی سے جا کر میری چارپائی پر بستر لگاؤ میں اپنے بیمار دوست کو لے کر آ رہا ہوں۔''

ریشم اپنا سوال بھول گئی۔وہ ٹیکسی سے اتر کر مکان کے دروازے پر آئی اور تالا کھولنے لگی۔

ایمان علی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنے جا رہا تھا۔اسی وقت ایک کار کی ہیڈ لائٹس قریب آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دروازہ کھولے کھڑا رہا۔کار سیدھی اس کی طرف آئی اور قریب آ کر رک گئی۔اس کی کھڑکی سے نثار نے سر نکال کر پوچھا۔

''کیا ایمان علی ٹیکسی ڈرائیور کا گھر یہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''جی ہاں میں ایمان علی آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نثار صاحب ہیں۔''

نثار نے کار سے اتر کر اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میرا نام نثار ہے۔تم نے آدھ گھنٹہ پہلے مجھ سے ہی فون پر بات کی تھی۔اب بتاؤ شہریار کہاں ہے۔''

ایمان علی نے ٹیکسی کی اندرونی لائٹ آن کر دی۔

''دیکھ لیجیے اور اچھ طرح پہچان لیجیے۔ میں ایمان علی ہوں کسی سے بے ایمانی نہیں کرتا۔''

وہ شہریار کے قریب جا کر اس کے شانے کو ہلاتے ہوئے بولا۔

''اٹھو دوست ! گھر آ گیا ہے۔اندر چل کر آرام سے سو جاؤ۔'' وہ کمبل کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔

نثار اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور پیچھے ہٹ کر خود کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔اسے خدشہ تھا کہ شہریار اسے پہچان لے گا۔ایمان علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اپنا یار کسی کو نہیں پہچانتا ہے۔آپ یہاں ٹھہریے میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔''

وہ شہریار کو سہارا دے کر مکان کی طرف جانے لگا۔

ریشم بستر پر دھلی ہوئی چادر بچھا رہی تھی۔دوسرے کمرے سے ایمان علی کی آواز آئی۔

''میں اپنے دوست کو لا رہا ہوں۔تم نے بستر بچھا دیا۔''

''جی ہاں بستر تیار ہے۔''

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''ایک جگ میں پانی اور ایک گلاس لا کر سرہانے رکھ دو۔''

وہ اپنے بھائی اور بھائی کے دوست کی جانب دیکھے بغر دوسرے دروازے سے کچن کی طرف چلی گئی۔

ایمان علی ،شہریار کو سہارا دیے بستر کے قریب آیا۔پھر اسے آرام سے بستر پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

''ریشم.................. پانی بعد میں لے آنا پہلے دو کپ چائے بنا دو ایک ملنے والا آیا ہے۔کمبخت کو چائے تو

پلانی ہی ہوگی۔''

شہریار بستر پر لیٹ گیا۔

ایمان علی نے دوسرے کمرے میں آ کر باہر کا دروازہ کھولا اور کہا۔

''نثار صاحب! تشریف لے آیئے۔ یہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

نثار کار کو لاک کرنے کے بعد کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں ایک ہی کرسی تھی۔ سامنے میز پر ریشم کی کتابیں اور کاپیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ نثار کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایمان علی نے ریشم کے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اب آپ کو اطمینان ہو گیا ہے کہ یہ وہی آدمی ہے، جس کی آپ کو تلاش تھی۔'' نثار نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں تم واقعی کام کے آدمی ہو۔ میں تمہیں انعام کے طور پر ہزار روپے دوں گا۔''

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بس، ایک ہزار روپے۔ اس کی تلاش میں تو ہزار روپے کا پٹرول جل گیا ہے۔''

وہ قائل ہو کر بولا۔

''ٹھیک ہے دو ہزار لے لینا۔'' ایمان علی ہنسنے لگا۔

''کیوں۔ ہنستے کیوں ہو۔''

''اس لیے ہنس رہا ہوں کہ آپ مجھے بے وقوف سمجھ کر ہزار دو ہزار روپے میں ٹرخا رہے ہیں۔ اگر میں اس بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ جاؤں جو آج شام کو اسے اسپتال سے لے جانے آئی تھیں تو وہ مجھے آپ سے زیادہ انعام دیں گی۔''

''کیا تم بیگم صاحبہ کو جانتے ہو۔''

''نہیں میں نے تو ان کی شکل بھی نہیں دیکھی، لیکن ہسپتال جا کر معلوم کر سکتا ہوں کہ وہ اس نوجوان کی کون ہیں اور کہاں سے آئی تھیں؟۔''

نثار سوچنے لگا ایمان علی نے کہا۔

''انعام کی بات ابھی رہنے دیجیے پہلے یہ بتائیے کہ یہ نوجوان کون ہے۔اور آپ اسے کہیں چھپا کر کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔؟''

''تمہیں ان باتوں سے کیا لینا ہے دو ہزار کم ہیں تو اور لے لو تم اپنے فائدے پر نظر رکھو۔''

''اپنے ہی فائدے پر نظر رکھ رہا ہوں۔نثار صاحب! میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔سواری بٹھانے سے پہلے سوچ لیتا ہوں کہ اسے کتنے لمبے راستے سے لے جانا چاہیے تاکہ میرا میٹر بڑھتا رہے ،آپ رستہ کاٹ کر نکل جانا چاہتے ہیں۔یہ اچھی بات نہیں ہے۔اگر آپ اس کے متعلق بتانے سے انکار کریں گے تو میں بیگم صاحبہ تک پہنچ جاؤں گا۔''

نثار پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگا۔اس وقت وہ ایمان علی کو ناراض نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اس سے کچھ چھپا سکتا تھا۔اس ٹیکسی ڈرائیور کو ان کی سازش کا علم کسی حد تک ہو گیا تھا۔بہتری اس میں تھی کہ اسے بھی اپنا رازدار بنا لیا جائے۔

ریشم چولہا سلگا رہی تھی۔جب آگ روشن ہو گئی تو اس نے چھوٹی سی دیگچی میں دو کپ چائے کے لیے پانی چڑھا دیا۔اس کے بعد وہ ایک جگ پانی اور ایک گلاس لے کر کمرے میں آ گئی۔شہریار دوسری طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا۔

وہ سرہانے کی طرف آئی اور چھوٹی سی تپائی پر جگ اور گلاس کو رکھنے لگی۔اس وقت شہریار نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔وہ سو نہیں رہا تھا۔صرف آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا ہوا تھا اس لیے ریشم کو نہ دیکھ سکا اور ریشم اسے دیکھتے ہی حیرت سے اچھل کر ایک قدم پیچھے چلی گئی۔

وہ جو آپ ہی آپ خیالوں میں چلا آتا تھا۔وہ آپ ہی آپ اس کے مکان کی چار دیواری کے اندر بھی چلا آیا تھا اور اس کے بھائی جان کے بستر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔

وہ پلکیں جھپک جھپک کر اسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ یہ تو اسپتال میں تھا پھر بھائی جان کو کہیں راستہ کیسے مل گیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ شہریار ان کا دوست ہے اگر دوست ہے تو وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ یہ کہاں رہتا ہے۔ پھر اسے اس کی کوٹھی میں پہنچانے کی بجائے یہاں کیوں لے آئے ہیں۔ کیا وہ

نہیں جانتے کہ ایک ماں اپنے بیٹے کے لیے کتنی پریشان ہوگی۔

اس کے دماغ میں بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔ وہ وہاں سے پلٹ کر اپنے بھائی جان کے پاس جانے لگی لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ اسے یاد آ گیا کہ اس کے بھائی جان سے کوئی ملنے آیا ہے۔ جس کے لیے وہ چائے تیار کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب اس اجنبی کے جانے کے بعد ہی اپنے بھائی جان سے باتیں کرے گی۔ ابھی اسے کچن میں جا کر چائے تیار کرنا چاہیے۔

اس نے دروازے سے پلٹ کر ایک بار پھر شہریار کی جانب دیکھا۔ اسی وقت ایمان علی کی آواز سنائی دی۔ وہ نثار سے کہہ رہا تھا۔

''ہوں تو آپ شہریار کو اس کی ماں سے دور لے جانا چاہتے ہیں۔''

''ہاں۔''

اتنی سی بات ریشم کو چونکانے اور اس کے دماغ میں تجسس پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ دروازے کی اوٹ سے انہیں دیکھنے لگی۔

ایمان علی چارپائی سے اٹھ کر کہہ رہا تھا۔

''اب سارا کھیل میری سمجھ میں آ گیا۔ آپ شہریار کے خالہ زاد بھائی ہیں اگر شہریار آپ کی خالہ سے دور رہا تو آپ اس کے ہوٹل میں سیاہ وسفید کے مالک بن جائیں گے اور وہاں کی آمدنی میں بڑی آسانی سے ہیرا پھیری کرتے رہیں گے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ جب ایمانداری سے دولت حاصل نہ ہو تو بے ایمانی سے حاصل کرنا چاہیے۔ ویسے اس دولت میں میرا حصہ کتنا ہوگا؟۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟۔''

''میں چاہتا ہوں کہ شہریار آپ کے ساتھ نہ جائے۔'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کیا مطلب۔ کیا تم ہمارا ساتھ نہیں دو گے؟۔''

''دوں گا۔ میں بھی زندگی گزارنے کے لیے چھوٹی چھوٹی سی بے ایمانیاں کرتا ہوں۔ لیکن منافع حاصل کرنے کے لیے کسی کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالتا۔ اگر آپ نے اسے کہیں لے جا کر مار ڈالا تو اس کا خون

میری گردن پر ہوگا۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''تم کیسی باتیں کررہے ہو۔میں ،میں اس کی جان کا دشمن نہیں ہوں۔''

ایمان علی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''نثار صاحب ! میں بچہ نہیں ہوں۔شہر یار کی موت کے بعداس کی ماں اسے تلاش ہی کرتی رہ جائے گی کچھ عرصہ کے بعدوہ بھی صبر کرے گی۔پھر ہوسکتا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ ہوٹل اوراپنی زمین ،جائیداد آپ کے نام کر جائے اور ایسا ہی ہوگا۔شہر یار کے بعد آپ ہی تمام دولت کے حق دار تسلیم کیے جائیں گے۔''

''اب آپ ہی بتائیے کہ میں اس بے چارے کو آپ کے حوالے کیسے کروں۔ میرا نام ایمان علی ہے۔ میرے دل کے کسی کونے میں تھوڑا سا ایمان باقی ہے۔اس لیے میں تھوڑے سے فائدے کے لیےاس موت کے منہ میں نہیں جانے دوں گا۔''

نثار کرسی سے اٹھ کر بولا۔

''تم خواہ مخواہ شبہ کررہے ہو۔میں اسے ہلاک نہیں کروں گا۔''

''تو پھر کیا کروگے۔''

''بس اسے کہیں چھپا دوں گا۔''

''کہیں دوسری جگہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔یہ میرے ہی گھر میں چھپا رہے گا اور اسے چھپانے کا معاوضہ صرف دس لاکھ روپے ہے۔''

وہ تقریبا" چیخ کر بولا۔

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔کیا یہ کوئی معمولی رقم ہے۔''

''ہاں ہوٹل شادمان شہر کا سب سے بڑا ہوٹل ہے۔روزانہ لاکھوں روپے کی آمدنی ہوگی۔اس میں سے دس لاکھ نکل جائیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

وہ جھلا کر بولا۔

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ہوٹل کی آمدنی ابھی میرے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔

''اب تک بے ایمانی سے جتنی رقم بنائی ہے اس میں سے دے سکتے ہیں۔ یکمشت نہیں تو تھوڑا تھوڑا کر کے دیجیے۔ آج ایک لاکھ دیجیے باقی قسطوں میں معاملہ طے ہو جائے گا۔''

وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس کی زبان بند رکھنے کے لیے اسے کسی نہ کسی طرح دس لاکھ کا انتظام کرنا ہی ہوگا۔

اس نے جیب سے پانچ ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

''اس وقت میرے پاس صرف پانچ ہزار ہیں باقی میں قسطوں میں ادا کروں گا۔ ہر ماہ بیس ہزار روپے مل جایا کریں گے۔''

''نہیں، ہر ماہ پچاس ہزار روپے لوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پر اتنی بڑی رقم کا بوجھ زیادہ عرصے تک رہے۔''

''اچھی بات ہے مجھے منظور ہے، لیکن تم شہر یار کو یہاں نہ رکھو یہاں سے کہیں دور لے جاؤ۔''

''لے جاؤں گا۔ ایسی جگہ لے جاؤں گا کہ آپ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

نثار نے اسے غرا کر دیکھا۔ پھر پلٹ کر وہاں سے جانے لگا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں۔ ذرا رک جایئے چائے آ رہی ہے۔'' اس نے دروازہ پر سے کہا۔

''شکریہ، میں رات کو چائے نہیں پیتا۔ خدا حافظ کل رات کو پھر آؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ ایمان علی دروازے پر آ کر اسے دیکھنے لگا۔

جب وہ کار میں بیٹھ کر چلا گیا تو سامنے والے مکان کی کھڑکی سے اس کی بھابی نے جھانک کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''یہ کون آیا تھا ایمان۔ تمہارے ہاں تو اب بڑی بڑی کار والے آنے لگے ہیں۔''

''ہاں آنے لگے ہیں۔'' ایمان علی نے ناگواری سے جواب دیا ''ان میں سے کوئی کار پسند آ جائے تو

اس کے نیچے آ کر مر جاؤ۔''

''اپنی بھابی کو مرنے کے لیے کہتا ہے۔مرنے کی دعا مانگتا ہے تو اپنے بھائی کے لیے مانگ۔وہ اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔دعا جلدی قبول ہو جائے گی۔''

''ہمارے لیے تو تم دونوں مر چکے ہو۔میں ایک بار سمجھائے دیتا ہوں کہ میرے گھر میں تاک جھانک نہ کیا کرو۔نہیں تو کسی دن تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گا۔''

یہ کہتے ہی اس نے ایک دھڑاکے سے دروازے کو بند کر دیا۔اسے اپنے پیچھے ریشم کی آواز سنائی دی۔

''آپ ساری دنیا کی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتے بھائی جان! صبح ہوتے ہی سارا محلّہ دیکھے گا اور پوچھے گا کہ شہر یار کون ہے۔۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا وہ اپنے بستر کے قریب کھڑی ہوئی تھی اس کے چہرے سے ناراضگی ظاہر ہو رہی تھی۔پھر بھی ایمان علی بہن کے تیور کو نہ بھانپ سکا۔اس نے پوچھا۔

''تم شہر یار کا نام کیسے جانتی ہو۔ کیا تم نے ہماری باتیں سنی ہیں۔''

''ہاں سنی ہیں اور سن کر شرم سے زمین میں گڑی جا رہی ہوں میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ دس لاکھ کے لالچ میں ایک بیٹے کو اس کی ماں سے جدا کر سکتے ہیں۔''

اس نے بہن کو غصے سے دیکھا مگر اس چہرے کی معصومیت کو دیکھتے ہی نرم پڑ گیا۔پھر سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''کہیں سے چار پیسے حاصل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں لالچی ہوں۔ایسا سبھی کرتے ہیں۔''

''سب کرتے ہیں مگر آپ کو نہیں کرنا چاہیے۔آپ کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے۔جس سے دوسروں کو نقصان پہنچتا ہو۔''اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ریشم کیا تم نہیں جانتیں کہ پہلے میں بھی بے ایمانی کو برا سمجھتا تھا۔کیا تمہیں یاد نہیں ہے کہ میری ایمانداری کا کیا نتیجہ ملتا رہا ہے۔''

ریشم کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے تلخ مناظر کے بعد دیگرے روشن ہونے لگے۔

ماضی کا ایک ایک لمحہ بھائی کے دل میں نشتر چبھو رہا تھا۔ بھابی اس کے منہ پر سو روپے کا نوٹ پھینکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''دن بھر ٹیکسی چلاتے ہو اور رات کو سو روپے لا کر دیتے ہو۔ میں نے کوئی لنگر خانہ نہیں کھولا ہے۔ میرے گھر میں رہنا ہے تو روز دو سو روپے دیا کرو۔''

اس کے بڑے بھائی فرمان نے کہا۔

''تمہاری بھابی ٹھیک کہتی ہیں۔ جب تم کماتے ہو تو ریشم کی خوراک بھی دیا کرو۔ تم اس کے کالج کی فیس دیتے ہو۔ کتابوں کے پیسے دیتے ہو۔ اس کے لیے نئے نئے جوڑے سلواتے ہو تو پھر یہاں اس کی خوراک کے پیسے کیوں نہیں دیتے۔''

''مجھے کیا معلوم تھا بھائی جان کہ آپ پیسے لیے بغیر اپنی بہن کو بھی روٹی نہیں کھلانا چاہتے۔''

بھابی نے ترخ سے جواب دیا۔

''ہاں نہیں کھلاتے اور کھلائیں گے کہاں سے۔ تمہارے بھائی جان کی تنخواہ ہمارے لیے پوری نہیں پڑتی ہے۔ ایک تو کھاتے ہوئے یہاں رہتے ہو اور صابن تیل بھی ہمارا ہی استعمال کرتے ہو۔ ہمارے ہاں درخت میں روپے نہیں پھلتے ہیں کہ تم دونوں کی ضرورتیں پوری کرتے رہیں گے۔''

فرمان علی نے کہا۔

''ایمان میں مانتا ہوں کہ تم جو کماتے ہو وہ آدھا ٹیکسی کی مرمت میں خرچ ہو جاتا ہے۔ کچھ پولیس والے لے جاتے ہیں اور کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تم ریشم کی تعلیم میں پیسے ضائع کر دیتے ہو۔ میری مانو اور ریشم کو کالج سے اٹھا دو۔''

ایمان علی نے جواب دیا۔

''ریشم آپ پر بوجھ بن گئی ہے تو میں اسے لے کر الگ ہو جاؤں گا۔ لیکن آپ کے مشوروں کو مان کر اس کا مستقبل برباد نہیں کروں گا۔''

بھابی نے غصہ سے کہا۔

''الگ ہونے کی دھمکی کیا دیتے ہو۔ جاؤ ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ سامنے والا مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔ میں بھی دیکھوں گی کہ الگ رہ کر تم ریشم کو کتنی تعلیم دلاتے ہو اور کتنے اونچے گھرانے میں بیاہتے ہو......اونہہ۔''

ایک منظر ختم ہو گیا۔

ریشم کی آنکھوں کے سامنے دوسرا منظر گھوم رہا تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ نئے مکان میں آ گئی تھی۔ چولہے ہانڈی کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ پھر ایمان علی بیمار پڑ گیا تھا۔ ٹیکسی دروازے پر ایک ہفتہ تک کھڑی رہی۔ آمدنی ختم ہو گئی مگر اخراجات بدستور رہے۔ وہ صحت یاب ہو کر اٹھا تو مالک مکان، پرچون فروش ، دودھ والا اور کارڈیلر اپنی اپنی رقم مانگ رہے تھے اور ٹیکسی پٹرول مانگ رہی تھی۔

اس نے کہیں سے قرض لینا چاہا لیکن اتنے سارے مطالبات پورے کرنے کے لیے اسے کہیں سے قرض نہیں ملا۔ وہ کسی غیبی مدد کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا کہ راہ چلتے اسے کہیں روپے کی تھیلی پڑی ہوئی مل جائے گی۔ لہذا اس بار مجبور ہو کر اس نے بے ایمانی شروع کر دی۔

وہ رات کو اپنی ٹیکسی کی ڈگی میں شراب کی بوتلوں کی پیٹیاں رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے لگا۔ یہ غیر قانونی کام تھا۔ لیکن اس کام سے اسے اتنی آمدنی ہوئی کہ ایک ماہ کی قسط اور ادا ہو گئی۔

رفتہ رفتہ اس نے بہت سے الٹے سیدھے دھندے سیکھ لیے۔ بلکہ حالات نے سکھا دیے۔ اب وہ کسی کا قرض دار نہیں تھا۔ کارڈیلر کے ایک لاکھ میں سے وہ ستر ہزار ادا کر چکا تھا۔ باقی قسطیں بھی ہر ماہ پابندی سے ادا کر رہا تھا اب کسی بہت بڑی بے ایمانی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ کارڈیلر کی پوری رقم ادا کرنے کے بعد وہ کالے دھندوں سے توبہ کر لے گا۔ جب قرضوں کو بوجھ نہیں رہے گا تو وہ ایک بہن کے ساتھ نہایت ایمانداری سے زندگی گزارے گا۔

زندگی کی ضرورتیں مکڑی کے جالے کی طرح ہوتی ہیں۔ انسان ان میں ایک مکھی کی طرح الجھ جاتا ہے۔

ایمان علی اس جال سے نکلنا چاہتا تھا مگر انہی دنوں محلے کی ایک بڑھیا کہیں سے ریشم کا رشتہ لے کر آ گئی۔

''بڑا اچھا لڑکا ہے۔ بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ اتنی آمدنی ہے کہ وہ روپے گنتے گنتے تھک جاتا ہے۔ اس کے

آ گے پیچھے کوئی نہیں ہے ریشم وہاں راج کرے گی۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ لڑکی غریب ہو مگر نیک اور پڑھی لکھی ہو۔ اب اپنی ریشم سے اچھی لڑکی اسے اور کہاں ملے گی۔ بس تم ہاں کہہ دو۔''

بڑھیا سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

ایمان علی نے خوش ہو کر کہا۔

''ماں جی! تم نے میری بہت بڑی فکر دور کر دی ہے۔ میں یہی خواب دیکھتا تھا کہ میری ریشم کسی بہت بڑے افسر ڈاکٹر یا انجینئر سے بیاہی جائے۔ میں نے جو اتنی محنت کر کے اسے تعلیم دلائی ہے، اس کا کچھ صلہ تو ملنا چاہیے۔ تم میری طرف سے ہاں سمجھو۔ ابھی وہ امتحان کے پرچے دے رہی ہے۔ تم ایک ہفتہ بعد کسی دن آ کر ذرا اس کی بھی مرضی معلوم کر لینا۔ میں اس کا بھائی ہوں۔ کچھ پوچھوں گا تو شرما جائے گی۔''

ماں جی نے کہا۔

''تم ریشم کی طرف سے اطمینان رکھو۔ میں کسی دن لڑکے کو چائے پر بلاؤں گی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ ریشم انکار نہیں کرے گی۔ تم اب جلدی سے اس کے جہیز کی تیاری شروع کر دو۔''

''جہیز......!'' ایمان علی نے تعجب سے کہا۔ ''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ وہ غریب لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''ہاں یہ تو میں اب بھی کہتی ہوں۔ لڑکا بہت نیک ہے جہیز کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ مگر تم کیا اپنی بہن کو ایک ہی جوڑے میں رخصت کرو گے۔ دنیا کیا کہے گی۔''

''نہیں ماں جی! میں اس کے لیے بہت سے کپڑے بنوا کر دوں گا۔''

''تو پھر کپڑوں کے لیے الماری بھی خریدو گے۔''

''ہاں خریدوں گا۔''

''دلہن زیورات کے بغیر اچھی نہیں معلوم ہوتی کچھ نہیں تو کان کے، ہاتھ کے اور گلے کے زیورات بنواؤ گے؟۔''

''ہاں بنواؤں گا۔اب تک یہی سوچ سوچ کر بہلتا رہا کہ میری بہن اتنی خوب صورت ہے کہ زیوروں کی محتاج نہیں ہے جب وہ بالوں میں پھول لگاتی ہے تو وہ ایک پھول تمام زیورات کی کمی پوری کر دیتا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے آج کل وہ پھول نہیں لگاتی ہے۔ کچھ پھیکی پھیکی سی نظر آتی ہے۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ پھول نہ لگا کر بڑی خاموشی سے شکایت کر رہی ہے کہ بھائی جان آپ میرے لیے زیور نہیں بنواتے۔ ایک پھول کی تعریف کر کے بہلا دیتے ہیں۔ جائیں میں پھول نہیں لگاؤں گی۔''

ماں جی نے کہا۔

''اگر وہ ایسا سوچتی ہے تو ٹھیک ہی کرتی ہے۔ دنیا والے تو یہی کہیں گے کہ تم نے اس اتنی تعلیم دلائی ۔مگر ایک زیور بنا کر نہ دے سکے۔ جب لڑکی کے رشتے کی بات آتی ہے تو اس وقت صرف تعلیم کے زیور کی نہیں ،سونے کے زیورات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔''

''میں دنیا والوں کو کہنے کا موقع نہیں دوں گا۔ میں اس کے لیے زیورات کے دو سیٹ بنواؤں گا۔ جہیز کا زیادہ سے زیادہ سامان خریدوں گا۔اس کی شادی میں تمام محلے والوں کو دعوت دوں گا اتنی دھوم دھام سے شادی کروں گا کہ اس محلے کی ہر بہن میرے جیسے بھائی کی مدد مانگے گی۔''

ماں جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اتنی دھوم دھام سے شادی کرنے کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت ہوگی اور اتنے روپے صرف ٹیکسی چلانے سے نہیں ملتے اور ٹیکسی چلانے والے کی کیا بات ہے۔ بڑے بڑے لوگ بھی اوپری آمدنی کے لیے اوپری دھندہ کرتے ہیں۔اپنا وہ ڈاکٹر بھی اسپتالوں کی چرائی ہوئی دوا لا کر اپنی دوکان میں مریضوں کا علاج کرتا ہے۔اگر ایسا نہیں کرے گا تو غریبوں کا سستا علاج کیسے کرے گا۔ سستا علاج ہوتا ہے۔اسی لیے تو اس کے ہاں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کچھ بھی ہو بیٹا ! وہ بے ایمانی کرتا ہے۔مگر غریب مریضوں کے ساتھ نیکی بھی کرتا ہے۔اس دنیا میں ایمان اور بے ایمانی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سچے اور کھرے انسان اب کہیں نہیں ملتے۔''

ایمان علی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں کہا۔''ماں جی ! میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں۔

ریشم کو دھوم دھام سے بیاہ کر کے رخصت کرنے کے لیے اس بار کوئی بہت بڑی بے ایمانی کروں۔ اتنی دولت کمانے والا ڈاکٹر نصیب والی لڑکی کو ملتا ہے اپنی ریشم کو نصیب والی بنانے کے لیے کوئی بہت بڑا جرم کرنا پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گا۔'

ماضی کے تمام مناظر چشم تصور سے اوجھل ہو گئے

اب ایمان علی کے سامنے ریشم اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی اور ریشم کے سامنے ایمان علی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ رات کی خاموشی میں وہ نہ جانے کب تک خاموش رہتے لیکن دوسرے کمرے سے شہریار کے کراہنے کی آواز آئی تو ریشم اپنے خیالات سے چونک گئی۔ اس نے دوسرے کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ اب اس طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ایمان علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''یہاں آتے وقت میں نے کہا تھا کہ اپنے بالوں میں پھول لگایا کرو۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی تھی کہ میں تمہیں سونے کے زیورات بنوا کر نہیں دے سکتا۔ میں دل کو بہلایا کرتا تھا کہ میری بہن سون چاندی سے نہیں ، پھولوں سے سجتی ہے۔ سونے چاندی کا اک مول ہوتا ہے مگر تمہارے بالوں کا پھول انمول ہے۔''

ریشم کی نظریں پھر اس کمرے کی طرف چلی گئیں ، جہاں شہریار سو رہا تھا وہ اس لیے تو پھول نہیں لگاتی تھی کہ وہ انمول ہے اور انمول چیز بغیر سوچے سمجھے کسی کے ضدی ہاتھوں میں نہ چلی جائے۔

ایمان علی نے کہا۔

''مگر اب میں نے ایک لاکھ روپے کا انتظام کر لیا ہے۔ اب میں تمہارے لیے سونے کے زیورات بنواؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی لڑکی ہو، ایک ہی انداز میں پھول لگاتے ہوئے اکتا جاتی ہے۔ تم بھی اکتا گئی ہو۔''

''کون کہتا ہے کہ میں اکتا گئی ہوں۔ میں تو ، میں تو'' وہ آگے نہ کہہ سکی۔ جلدی سے بات بدل کر بولی۔

''میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ ایک بیٹے کو اس کی ماں سے چھین کر میں سونے کے زیورات تو نہیں پہنوں گی۔

آپ خود ہی سوچیے۔اگر کوئی مجھے آپ سے چھین کر لے جائے تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔''

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور جوشیلے انداز میں مٹھیاں بھینچ کر بولا۔

''کس کی مجال ہے کہ کوئی تمہیں ہاتھ بھی لگائے۔میں اس کی لاش گرا دوں گا۔خبردار آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا۔میں جو کچھ کر رہا ہوں تمہاری بھلائی کے لیے کر رہا ہوں اور تم ہو کہ مجھے بار بار بے ایمانی کا احساس دلا رہی ہو۔میں بے ایمانی نہیں کروں گا تو یہ روپے کہاں سے آئیں گے۔ کیا میں ساری عمر تمہیں گھر بٹھا کر دنیا والوں کے طعنے سنتا رہوں گا۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ طعنے سنوں گی! لیکن شہریار پر ظلم نہیں ہونے دوں گی۔''

وہ غصہ سے چیخ کر بولا۔

''تو پھر جاؤ۔تھانے میں جا کر اپنے بھائی کے خلاف رپورٹ کر دو کہ میں نے شہریار کو یہاں چھپا رکھا ہے۔پولیس آئے گی اور مجھے گرفتار کر کے لے جائے گی۔جاؤ دنیا یہ بھی تماشہ دیکھ لے گی کہ ایک بھائی اپنی بہن کو سہاگن بنانا چاہتا ہے اور بہن اسے جیل کی چار دیواری میں بھیجنا چاہتی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور تیزی سے دروازے کی طرف جانے لگا ریشم نے آواز دی۔

''بھائی جان............''

بہن کی آواز پر اس کے قدم نہیں رکے۔اس نے دروازے کو ایک جھٹکے سے کھولا اور غصے سے بھناتا ہوا باہر چلا گیا۔

وہ گم صم کھڑی تھی اور کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔اس کے دماغ میں ایک سوال آ رہا تھا۔ایک جا رہا تھا۔ایک سوال آیا۔کیا وہ شہریار سے ہمدردی کر سکتی ہے۔ وہ سوال چلا گیا۔دوسرا سوال آیا۔کیا وہ اپنے بھائی جان کی مخالفت کر سکتی ہے۔

نہیں ، یہ بھی نہیں کر سکتی۔وہ بھی نہیں کر سکتی کچھ بھی نہیں کر سکتی۔

وہ شہریار کی والدہ کو بھی فون پر نہیں بتا سکتی کہ ان کا بیٹا اس کے گھر میں محفوظ ہے۔پھر طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے کہ شہریار کس کے گھر میں ہے۔ تم کون ہو۔ میرے بیٹے کو میرے پاس کیوں نہیں

لے آتیں۔ مجھے اس گھر کا پتہ نہیں بتاتیں۔

اور وہ پتا بتائے گی تو بھائی جان کا جرم سامنے آ جائے گا۔

وہ بھائی جس نے اسے ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت دی۔کیا اسے دنیا کی نظروں سے گرا سکتی ہے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

ہر انسان زندگی کے کسی دوراہے پر اسی طرح بے بس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

☆☆☆☆

شہریار کی آنکھ اچانک ہی کھل گئی۔

وہ چاروں طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔کمرے کا وہ ماحول اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ذرا دیر بعد اسے یاد آ گیا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اپنا نام ایمان علی بتایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس کا پرانا جگری یار ہے اور ایمان علی نے کیا کہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔

وہ آہستگی سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا پھر سرہانے تپائی پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پینے لگا۔

پانی پینے کے بعد اس نے میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس کو دیکھا۔تین بج رہے تھے۔نہ جانے وہ کب تک سوتا رہا تھا۔اب اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔وہ بستر سے اتر کر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جانے لگا۔

دروازے کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔اس سے پرے ایک آنگن تھا۔رات کی رانی خوشبو لٹا رہی تھی۔چاند کی روشنی میں ایک گلاس کا پودا ہوا کے جھونکوں سے لہلہا رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک خوشبو سے مہکتی ہوئی فضا میں سانس لیتا رہا۔پھر دائیں طرف گھوم کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔

دوسرے کمرے میں ریشم سو رہی تھی۔اس کے سونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی جان کے انتظار میں بیٹھے ہی بیٹھے نیند کے غلبہ سے بستر پر نیم دراز ہوگئی ہے۔شہریار سر جھکائے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ پھر اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے دل نے بے اختیار کہہ دیا۔ وہی ہے وہی جو اسپتال میں آئی تھی اور جسے دیکھ کر میرا دماغ بار بار چیختا ہے کہ میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔اسپتال میں یہ بھی مجھے بار بار دیکھتی رہی تھی۔ہم دونوں ضرور ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔شاید ہمارے درمیان کوئی رشتہ بھی ہے۔میرا دوست ایمان علی مجھے صحیح منزل تک لے آیا ہے۔

لیکن وہ ایمان علی کہاں ہے۔

اس کمرے میں بھی نہیں ہے۔اس کمرے میں بھی نہیں ہیں۔آنگن میں بھی نہیں ہے۔اس نے آنگن کی طرف پلٹ کر دیکھا تو گلاب کے مسکراتے ہوئے پھول نظر آ گئے۔پھولوں کے ساتھ سیاہ زلفوں کا رشتہ یاد آ گیا۔اس نے کمرے کے اندر پلٹ کر دیکھا تو ریشم کی زلفیں کچھ ویران سی نظر آ رہی تھیں۔

چشم تصور میں ایک پھول اس کی زلفوں میں آ کر سج گیا۔اب وہ محض ایک پھول کے افسانے سے مکمل ہو گئی تھی۔

اس نے غور سے دیکھا تو وہ پھول ایک سراب کی طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ پھر نامکمل رہ گئی۔

دماغ کے فریم میں ایک موہنی سی تصویر اسی طرح بنتی بگڑتی رہتی تھے۔تصور میں کبھی چہرہ ابھرتا تو وہ پھول کی عدم موجودگی میں ادھورا رہ جاتا اور کبھی نگاہوں کے سامنے پھول کھلتا تو وہ چہرہ کہیں گم ہو جاتا۔ پرانی یادیں اسی طرح اس سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی تھیں۔

لیکن اس وقت چہرہ بھی سامنے تھا اور پھول بھی آنگن میں کھلا ہوا تھا۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں ایک سنگم پر آ کر مل جائیں پھول کی زلفوں میں پھول کھل جائے تو کیا ہو۔

کیا وہ حسین چہرہ واقعی مکمل ہو جائے گا۔

کیا اس چہرے کو دیکھتے ہی اسے یاد آ جائے گا کہ وہ اس حسینہ کو کس حیثیت سے جانتا ہے۔

ہاں یاد آ سکتا ہے۔ سب کچھ یاد آ سکتا ہے۔

وہ مضطربانہ انداز میں کبھی پھول کو اور کبھی ریشم کو دیکھنے لگا۔ منزل کے قریب پہنچ کر منزل کو نہ پہچاننا نادانی ہے۔ وہ تیزی سے گھوم کر گلاب کے پودے کی طرف جانے لگا۔

ایک پھول توڑتے وقت یہی بات اس کے ذہن میں تھی کہ وہ اسے ریشم کے بالوں میں لگائے گا اور جو تصویر اس کی یادداشت میں ادھوری رہ جاتی ہے اسے مکمل کر دے گا۔

لیکن کمرے میں پہنچتے ہی اس کی انگلیوں کی گرفت میں پھول لرزنے لگا۔

وہ ایک اجنبی دوشیزہ کے بالوں میں کس طرح پھول لگائے۔ اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ کیا کہے گی۔ کیا ناراض ہو جائے گی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ خوابیدہ چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ ناراضگی کی ہلکی سی شکن بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہیں ، وہ ناراض نہیں ہو سکتی۔

وہ ایک ایک قدم جھجکتے ہوئے بستر کے قریب پہنچ گیا اور پھر شہریار نے دل ہی دل میں کہا۔

''میرے ذہن کے آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ان بالوں کے پیچھے یہ چاند کبھی چھپتا ہے اور کبھی لمحہ بھر کے لیے اجاگر ہو جاتا ہے۔

میں اس چاند سے چہرے کو جانتا ہوں۔ لیکن پہچانتا نہیں ہوں۔

اے مجھ سے آنکھ مچولی کھیلنے والی لڑکی ! میں تجھے پھول کا تحفہ دیتا ہوں۔ تو مجھے نوید شناسائی دے۔''

یہ سوچتے سوچتے اور کانپتے کانپتے اس نے بالوں میں پھول ٹانک دیا۔

وہ چہرہ مکمل ہو گیا تھا۔

وہ چہرہ کار کی ونڈ اسکرین کے پار نظر آ رہا تھا۔ بیچ راستہ پر کھڑی ہوئی ریشم کے ہاتھوں سے کتابیں گر پڑی تھیں۔

وہ کس کی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریشم کس راستے پر کھڑی ہوئی تھی۔

اسے شاید سب کچھ یاد آ جاتا۔ لیکن ریشم نے سوتے سوتے کروٹ بدل لی۔ بالوں میں لگا ہوا پھول دوسری کروٹ میں جا کر چھپ گیا اور چہرہ پھر ادھورا رہ گیا۔ یادداشت کے پردے میں نظر آنے والے مناظر

کہیں گم ہو گئے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر ذہن پر زور ڈالنے لگا۔

وہ ذراسی دیر میں کہاں پہنچ گیا تھا۔ کسی کار میں کسی سڑک پر کیا ایسا کوئی واقعہ گزرا ہے کہ وہ کار میں بیٹھا ہوا اور راستہ میں کھڑی ہوئی ریشم کے ہاتھوں سے کتابیں گر پڑی ہوں۔

وہ اپنے ماضی کے اندھیرے میں دور دور تک بھٹک رہا تھا اور پھول سے آراستہ چہرے کو تلاش کر رہا تھا۔ چہرہ تو سامنے تھا۔ لیکن...... لیکن وہ پھول نہیں تھا۔ وہ سڑک پر بکھری ہوئی کتابیں نہیں تھیں وہ کار اور وہ راستہ نہیں تھا۔ وہ کیا سوچے اور کیا نہ سوچے۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ جو کچھ وہ سوچ رہا ہے وہی واقعہ اس کے ساتھ کبھی پیش آیا ہو۔

وہ سوچتے سوچتے گھبرا سا گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دماغ کے پنجرے میں وہ بند پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا رہا ہے۔ اگر اس نے ذہنی بھاگ دوڑ سے نجات حاصل نہ کی تو گھبرا کے مر جائے گا۔

اس نے ریشم کی طرف سے رخ پھیر لیا۔

اب اس میں مزید کچھ سوچنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے دروازے کے پاس آیا اور اس کھول کر باہر نکل گیا۔

موسم سرما کا آغاز تھا۔ باہر کی سرد ہوائیں اسے چھو رہی تھیں کمرے کی گھٹن سے نکلنے کے بعد یہ خنک ہوائیں اس کے ذہن کو چھونے لگیں۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور اس محلے کو دیکھنے لگا۔

درخت سے ذرا پرے ایک کچی سڑک تھی۔ سڑک کے دونوں جانب ٹوٹے ہوئے کچے پکے مکانات نظر آ رہے تھے۔ چاندنی رات میں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کھنڈر کے درمیان آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ ان مکانوں کی خستہ حالی اور ان کے اندر چھائی ہوئی تاریکی بتا رہی تھی کہ اس محلے کے لوگ کتنے غریب ہیں۔

وہ سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ایمان علی وہاں بیٹھا ہو گا۔ ٹیکسی کے دروازے بند تھے اور اس کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ ایمان علی اندر نہیں تھا۔ اسے یہاں چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

اسی وقت قریب کے ایک مکان سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔شہر یار نے ادھر ادھر دیکھا۔ایک مکان کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے کسی بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی اور کوئی بیدردی سے اسے پیٹ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔

''بھوک لگی ہے تو گالی کھاؤ۔بھوک لگی ہے تو مار کھاؤ۔کھانے کے لیے نصیب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔اتنی رات ہوگئی ہے۔اب صبح ہونے والی ہے۔مگر ان کم بختوں کو نیند ہی نہیں آتی۔''

شہر یار کھڑکی کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔کسی لڑکی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ابا! تو معصوم بچے پر کیوں غصہ اتار رہا ہے۔صاف کیوں نہیں کہتا کہ تجھے بھوک ستا رہی ہے۔کیا باجی ہمیشہ تجھے بھوکا رکھتی ہے۔کیا ہم سب کو تین وقت کی روٹیاں نہیں کھلاتی ہے۔'' بوڑھے کی آواز آئی۔

''کھلاتی ہے تو کون سا احسان کرتی ہے۔میں نے اسے پال پوس کر جوان کیا ہے۔بوڑھا ہونے تک محنت مزدوری کی ہے اب دو قدم چلتا ہوں تو ہانپنے لگتا ہوں۔کاش کہ تم دو بیٹیوں کے بجائے میرا ایک ہی بیٹا ہوتا۔وہ مجھے اس بڑھاپے میں فاقے نہ کرنے دیتا۔''

شہر یار سر اٹھانے بڑی حیرانی سے اس ٹوٹی ہوئی کھڑکی کو دیکھ رہا تھا۔وہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی نہیں تھی سماج کی گندی نالی کی ایک موری تھی ، جہاں سے غریبی غلاظت بن کر بہہ رہی تھی۔

شہر یار کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔''یا اللہ! میں کس دنیا میں آ گیا ہوں مجھے یاد نہیں آتا کہ میں پہلے بھی ایسی دنیا میں رہ چکا ہوں۔

خداوندا' اگر تو نے ،اگر تو نے کس آزمائش کے لیے مجھے یہاں بھیجا ہے تو مجھے اتنی دولت دے کہ میں اس غریبی کو ہمیشہ کے لیے اس زمین سے اٹھا دوں یہ غریبی تمام انسانوں کی توہین ہے۔''

وہ اچانک اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔اسے یاد آ گیا اس کے پاس پچاس روپے کا ایک نوٹ ہے۔پھر یہ بھی یاد آ گیا کہ جیبیں پھٹی ہوئی ہیں اور وہ نوٹ تہہ کی ہوئی آستین میں رکھا ہے ایمان علی نے اسے وہ نوٹ خرچ کرنے سے روک دیا تھا۔دودھ اور مکھن کی ٹکیہ کے پیسے اسی نے دیے تھے۔

اس نے آستین سے وہ نوٹ نکال کر زمین پر سے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اسے نوٹ میں لپیٹنے لگا۔اس

کے بعد وہ کھڑکی کے قریب آ گیا۔

ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے کمرے کے اندر کھڑی ہوئی ایک لڑکی کی پشت نظر آ رہی تھی اس نے لڑکی کا نشانہ لے کر نوٹ پھینک دیا۔ پھر جلدی سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا اپنے مکان کے دروازے پر آ گیا۔

وہ اپنی سخاوت کا ردعمل نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور نہ ہی ان پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس نے کسی کی ماں بیٹی یا بہن کے بکنے کی داستان سن لی ہے۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے پہلے کی طرح چٹخنی چڑھا دی اور ریشم کی طرف ایک نظر ڈالی۔

وہ بے خبر سو رہی تھی۔ پھول ابھی تک دوسری کروٹ تلے چھپا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور وہاں کی لائٹ آف کر دی۔

کمرے میں اندھیرا ہو گیا لیکن کھڑکی سے وہ چاندکی روشنی اندر آنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آ گیا۔ باہر چاندنی میں ایک نوجوان لڑکی اور ایک بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ لڑکی نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''یہاں تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ جانے کون فرشتہ تھا۔ پانچ روپے پھینک کر چلا گیا۔'' بوڑھے نے کہا۔

''مگر اتنی جلدی کہاں چلا جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ نوٹ چھپر سے آیا ہے۔ واہ اللہ میاں تو نے چھپر پھاڑ کے بھی دیا تو صرف پچاس روپے کا نوٹ کچھ زیادہ ہی دے دیتا تو تیرے خزانے میں کون سی کمی آ جاتی۔''

ناول لکھنے والا غریب انسانوں کی زندگی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

اتنے میں دور سے ایمان علی کی آواز آنے لگی۔ شہریار نے بائیں طرف گھوم کر دیکھا۔ دور کچی سڑک پر وہ لڑکھڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ کان پر ہاتھ رکھے ہوئے بے سری آواز میں کچھ گا رہا تھا۔

پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ٹیکسی کی طرف آنے لگا۔ شہریار نے سوچا کہ دوسرے کمرے میں جا کر باہر کا دروازہ کھول دے پھر اس نے سوچا کہ نہیں پہلے اسے دروازہ کھٹکھٹانے دیا جائے وہ لڑکی اٹھ کر دروازہ کھولے گی تو میں اس سے باتیں کروں گا اس سے پوچھوں گا کہ جب ہم دونوں اجنبی ہیں تو پھر اس طرح ایک

دوسرے کے قریب کس طرح آ گئے ہیں۔

وہ سوچتا رہا ، لیکن ایمان علی مکان کی طرف نہیں آیا وہ اپنے دونوں بازو پھیلائے ٹیکسی سے لپٹ رہا تھا اسے چوم رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔

شہر یار نے کھڑکی کی سلاخوں پر سر ٹیک دیا۔ اس وقت چاند بادلوں میں چھپ رہا تھا۔ چاندنی ڈوبتی جا رہی تھی۔ اسی ڈوبتی ہوئی چاندنی میں اک سایہ کچی سڑک پر آتا ہوا نظر آیا۔ رات کی خاموشی میں کھانسنے کی آواز آئی تو شہر یار کو پتا چلا کہ وہ ایک عورت ہے سایہ نہیں سیاہ برقعہ ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کراہتی ہوئی اور کھانستی ہوئی قریب آتی جا رہی تھی۔

پھر وہ ایمان علی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

پلٹ کر جھومتے ہوئے پوچھا۔

''کون شبو؟۔''

''ہاں!'' اس نے نقاب الٹ دی۔

وہ غرا کر بولا۔ ''تو رات کو باہر جانے لگی ہے۔ کیا تجھے اس محلے کی عزت کا خیال نہیں ہے۔''

وہ سر جھکا کر کھانسنے لگی۔ کوئی جواب دیے بغیر اپنے مکان کی جانب بڑھتی ہوئی اس کھڑکی کے قریب سے گزرنے لگی جہاں شہر یار کھڑا ہوا تھا۔

ایمان علی نے آواز دی۔ ''ٹھہر جا۔''

وہ رک گئی۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے اس کے قریب آیا۔ اس کے لہجے میں اچانک نرمی پیدا ہو گئی ۔

''کیا تو بیمار ہے۔''

وہ نقاہت سے بولی۔ ''ہاں !''

ایمان علی نے سر جھکا کر آہستہ سے پوچھا۔ ''آج تجھے کیا ملا۔''

''کچھ نہیں۔'' امان علی نے جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر کہا۔

''جا آرام کر کل صبح میں تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔'' وہ انکار کرتی ہوئی بولی۔

''نہیں ایمان! تجھے ہم سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو تو میری بہن کا ہاتھ تھام لے۔ نجو تجھے چاہتی ہے۔ تو بھی جانتا ہے کہ وہ پاکباز ہے۔''

وہ سوچنے لگا۔ شبو نے پوچھا۔

''کیا میری نجو اس قابل نہیں ہے کہ کوئی شریف آدمی اس اپنے گھر کی عزت بنا سکے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''نجو بہت اچھی ہے۔ جب وہ مجھے دیکھتی ہے تو مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔

شبو! تو اپنی بہن کو سہاگن بنانا چاہتی ہے۔ میں اپنی بہن کو دلہن بنانا چاہتا ہوں۔ جب تک اس کی ڈولی یہاں سے نہیں اٹھے گی، اس وقت تک میں نجو کے خواب دیکھتا رہوں گا۔

ہم سب مجبور ہیں۔ اپنے حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ہم ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی ہمدردیاں کر سکتے ہیں۔ تو یہ روپے رکھ لے انکار کرے گی تو میں سمجھوں گا تو مجھے غیر سمجھتی ہے۔''

''نہیں، نہیں، ایمان! تو اپنوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ تیرے آسرے پر تو میں نے چیئرمین کو بھی اپنا دشمن بنالیا ہے۔''

''تو اس کی فکر نہ کر۔ الیکشن کا ٹائم آ گیا ہے۔ میں اسے سیدھا کر کے رکھ دوں گا۔ اب ایک جگہ سے میری آمدنی بڑھ گئی ہے میں میں روزانہ کچھ روپے تیرے علاج کے لیے خرچ کر سکتا ہوں۔ اب کل سے کام پر مت جاتا۔ تم لوگوں کا خرچ برداشت کرنے کے لیے مجھے اور زیادہ بے ایمانی کرنی پڑی تو کروں گا۔''

شبو نے متاثر ہو کر کہا۔ ''ایمان تو ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ہے۔ تجھ جیسے آدمی کو اس محلے کا چیئرمین ہونا چاہیے۔''

ایمان علی نے نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اب زیادہ باتیں نہ کر تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جا آرام سے جا کر سو جا۔ صبح میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا۔''

وہ خاموشی سے سر جھکا کر اپنے مکان کے اندر چلی گئی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اب ایمان علی بھی اپنے مکان میں واپس آئے گا لیکن وہ لڑکھڑاتے ہوئے ٹیکسی کے پاس چلا گیا۔اس کے اگلے دروازے کو کھولا اور اگلی سیٹ پر لمبے لمبے لیٹ گیا۔

وہ ٹیکسی اس کے بیٹھنے ، لیٹنے اور سر چھپانے کی پناہ گاہ تھی۔اس چھوٹی سی ٹیکسی میں اس نے دنیا کے کتنے تماشے دیکھے تھے اور رات کو خود تماشا بن کر اس میں سو جاتا تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے پلٹ گیا اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔پھر سوچتے سوچتے گہری نینداس پر حاوی ہو گئی۔



صبح سویرے جب آنگن میں چڑیاں چہچہانے لگیں تو ریشم کی آنکھ کھل گئی تھی۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔اتنا وہ تسلیم کر چکی تھی کہ شہریار کا نام آتے ہی یا اس کی یاد آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔اچانک پھول کے خیال سے بے اختیار اس کا سر اپنے ہاتھ پر گیا پھر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔وہاں اس کی زلفوں میں ایک پھول الجھا ہوا تھا۔

کیا یہ پھول شہریار نے لگایا ہے؟۔

'لیکن نہیں وہ تو پچھلی رات گہری نیند سو رہا تھا۔پھر یہ پھول کہاں سے آ گیا۔؟'

وہ بستر سے اٹھ کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی دوسرے کمرے کے دروازے پر آئی شہریار اپنے بستر پر سو رہا تھا۔اسے دیکھ کر یاد آیا کہ وہ تو اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔وہ اپنا نام اور اپنے گھر کا پتا بھول چکا ہے۔اس نے اسپتال میں مجھے بھی نہیں پہچانا۔جب میں اس کے ذہن سے مٹ گئی ہوں،تو یقیناً" وہ پھول کو بھی بھلا چکا ہو گا۔

ریشم کے دل میں اداسی گھر کرنے لگی۔پہلی بار یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ وہ شہریار کے ذہن سے مٹ گئی ہے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے بستر کے قریب آ گئی۔

شہریار نیند کی حالت میں بہت ہی معصوم اور مظلوم نظر آ رہا تھا۔ ہاں وہ یقیناً" مظلوم تھا۔ اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ اپنے گھر سے دور ہو گیا تھا اور اس کے دشمن بھی اسے ماں کے سائے سے دور کر دینا چاہتے تھے۔

وہ ہمدردی سے اسے دیکھنے لگی۔

اس وقت اس کے دماغ میں بات آئی کہ وہ شہریار کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ جس سے اس کا بھائی مجرم کہلائے

لیکن وہ بڑی خاموشی سے شہریار کی یادداشت واپس لانے کی کوشش کر سکتی تھی جب اسے سب کچھ یاد آ جائے گا تو وہ خود ہی اپنی حفاظت آپ کرے گا اور اپنی ماں تک پہنچ جائے گا۔

لیکن اس کی یادداشت کیسے واپس لائی جائے۔

یہ پھول ، یہ پھول جو میرے بالوں میں ابھی الجھا ہوا ہے۔ کیا یہ اسے کچھ بھولی بسری باتیں یاد دلا سکتا ہے۔

ہاں ، شاید اس س کوئی بات بن جائے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔

اس نے اپنے ہاتھ میں مہکتے ہوئے پھول کو دیکھا اور سوچنے لگی کہ اگر وہ اس پھول کو شہریار کے سرہانے رکھ دے تو وہ بیدار ہونے کے بعد اسے دیکھے گا کچھ سوچے گا ، کچھ سمجھے گا اور سمجھ میں نہیں آئے گا تو اس پھول کے متعلق مجھ سے پوچھے گا؟۔

یہ سوچ کر اس نے پھول کو آہستگی سے تکیہ پر رکھا

اگرچہ وہ بہت آہستگی اور احتیاط سے کام لے رہی تھی مگر شہریار کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی شہریار کی سمجھ میں فورا" ہی یہ بات آئی کہ وہ کہاں ہے۔ صرف اس کی محبوبہ کا چہرہ عین نگاہوں کے سامنے کھل رہا تھا۔ اچانک ہی نیند کی وادیوں سے بھٹکتے ہوئے وہ چہرہ سامنے آیا تو جیسے خواب کو بریک لگ گیا گاڑی رک گئی اور وہ کار کی ونڈ سکرین سے یک بارگی ریشم کو پہچاننے لگا۔

وہ سہمی سہمی اور شرمائی شرمائی سی کھڑی تھی ۔

کار ونڈ سکرین ریشم کالج کی لڑکیاں ،سڑک پر بکھری ہوئی کتابیں اور ایک دوسری کار میں بیٹھنے والی لڑکی اسے ریشم کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

شہر یار یک بیک اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔

''میں تمہیں جانتا ہوں۔تمہیں پہچانتا ہوں۔تمہارا نام ریشم ہے۔''

ریشم نے چونک کر اسے دیکھا۔'وہ مجھے پہچانتا ہے۔میرا نام جانتا ہے۔شاید اسے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔' وہ گھبرا کر تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ ونڈ سکرین سے غائب ہوگئی۔

شہر یار خواب سے حقیقت تک بھٹک رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

اگر خواب ٹوٹتے ہی ریشم یک بیک نگاہوں کے سامنے نہ آتی تو شاید اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔مگر آنکھ کھلتے ہی اس کے حسین مکھڑے نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔

اس کے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔

دماغ کی ونڈ اسکرین پر وہ پھر خود کو ریشم کے ساتھ دیکھنے لگا۔شہر یار کا سر گھوم رہا تھا۔اس کے آس پاس ماضی کا ایک ایک لمحہ گھوم رہا تھا۔ایک ایک بات دماغ کے تاریک گوشوں سے ابھرتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنی امی کو دیکھا جو ایک بہولانے کی ضد کر رہی تھیں۔

اس نے پبلشر جبار صدیقی کو دیکھا۔اس کے سامنے وہ چیلنج کر رہا تھا کہ وہ غریبوں کی زندگی پر ناول لکھ سکتا ہے۔

اس نے ہوٹل کے منیجر بشیر کو دیکھا جس کے سامنے وہ جرمنی جانے کا فریبی منصوبہ بنا رہا تھا۔

پھر اس نے خود کو ایک ملازم کے لباس میں دیکھا اندھیرے راستے میں دو سپاہی ملے جو اس سے ہزار روپے کا نوٹ لے رہے تھے۔اندھیری گلی میں پیچھے سے چند بدمعاشوں نے حملہ کیا تھا اور وہ بیہوش ہو گیا تھا۔پھر اسپتال ،نرس ،اسی اسپتال میں پھر ریشم کا دیدار وہ جہاں گیا۔یہ جان تمنا اس کے سامنے آ گئی یہاں

ایمان علی لے کر آیا تو یہاں بھی وہ موجود تھی۔

اور پچھلی رات اس نے اس کے بالوں میں پھول لگایا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ یا خواب دیکھ رہا تھا۔ یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کی حالت جیسی بھی تھی۔ وہ اس دنیا سے غافل ہو گیا تھا اور اپنی دنیا میں بھٹک رہا تھا۔

☆☆☆☆

شہر یار آنکھیں بند کیے سکون سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے پیچھے اندھیرا تھا مگر اس کی دنیا روشن ہو گئی تھی۔ وہ اپنی موجودہ حالت کو بھی سمجھ رہا تھا اور ماضی کے ایک ایک لمحہ کو بھی پہچان گیا تھا۔

لیکن بہت زیادہ سوچنے کے باعث اس کا دماغ بہت تھک گیا تھا۔ اس لیے خاموش پڑا ہوا تھا۔ اتنے میں اسے کسی کی آواز سنائی دی۔

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ ہوش میں آ جائیں گے۔ ویسے یہ تو بتائیے کہ بیہوش کیسے ہو گئے تھے۔''

ایمان علی نے کہا۔ ''پتا نہیں ڈاکٹر صاحب ! میں گھر میں نہیں تھا۔ یہ میری بہن تھی ۔ یہی دوڑتی ہوئی میرے پاس گئی کہ شہر یار کو کچھ ہو گیا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب ! جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں کہ شہر یار صاحب میرے لیے اجنبی ہیں پچھلی رات یہاں آئے ہیں۔ لیکن صبح آنکھ کھلتے ہی انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ میں تمہیں جانتا ہوں تمہیں پہچانتا ہوں۔ تمہارا نام ریشم ہے۔ میں فورا" ہی اس کمرے سے جانے لگی۔ پھر دروازے کے پاس پہنچ کر ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ پھر یہ بالکل بے جان سے ہو کر بستر پر گر پڑے۔''

ریشم کہہ رہی تھی اور شہر یار کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ جو تھوڑی دیر تک غافل رہا ہے۔ وہ غفلت دراصل بیہوشی تھی۔ اس عرصے میں نہ جانے کیا کچھ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے انجکشن لگا چکا تھا۔ کیا پتا کتنا وقت گزر گیا تھا۔ اس دوران وہ ماضی کی بھولی ہوئی راہوں میں سفر کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر رخصت ہو گیا۔ شہر یار کی بند آنکھوں میں ریشم کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ

آنکھیں کھول کر اس جان تمنا کو دیکھے مگر اس کمرے میں کسی اور لڑکی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔اس کی آواز کو اس نے پچھلی رات سنا تھا۔اس لیے پہچان گیا کہ وہ نجو ہے۔

اس وقت نجو ریشم سے کہہ رہی تھی۔

''تمہارے بھائی جان فرشتہ ہیں۔وہ ڈاکٹر صاحب کو باجی کے پاس لے گئے ہیں اللہ نے چاہا تو باجی جلد ہی اچھی ہو جائیں گی۔''

ریشم نے جواب دیا۔

''بھائی جان فرشتہ ضرور ہیں۔مگر شہر یار صاحب کے لیے دشمن ہیں۔''

نجو نے حیرانی سے کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟۔''

''میں یہ سچ کہہ رہی ہوں نجو۔ یہ شہر یار صاحب اپنی یادداشت کھو چکے ہیں۔مگر ابھی انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ ان کے ذہن کو زبردست جھٹکے لگے ہیں۔اسی لیے یہ بے ہوش ہو گئے ہیں۔پتا نہیں ہوش میں آنے کے بعد پھر مجھے پہچانیں گے یا نہیں۔مگر میں خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ یہ اپنے ماضی کو پہچان لیں اور اپنی ماں سے جا ملیں۔ بھائی جان چاہیں تو انہیں ان کی ماں تک پہنچا سکتے ہیں۔لیکن نثار نامی ایک بدمعاش نہیں چاہتا کہ ماں بیٹے ایک دوسرے سے ملیں۔شہر یار صاحب کو ان کی ماں سے دور رکھنے کے لیے وہ میرے بھائی جان کو ہر ماہ روپے دینے پر بھی آمادہ ہے۔''

نجو نے پھر حیرانی سے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ کیا چکر ہے۔''

ریشم اسے پوری تفصیل سے تمام واقعات سنانے لگی۔

شہر یار آنکھیں بند کیے سب کچھ سن رہا تھا۔اس کے سامنے کچھ اور حقیقتیں روشن ہو رہی تھیں' وہ سمجھ گیا کہ نثار اپنی بیوی کے ساتھ مل کر یہ سازش کر رہا ہے کہ ایک بیٹا اپنی ماں سے دور رہے۔دور رکھنے کے لیے وہ بیٹے کی جان بھی لے سکتا ہے۔

ایمان علی کا بھی کردار سمجھ میں آیا۔ وہ ایک ہی وقت میں اسے اس کی ماں سے دور رکھ کر دشمنی بھی کر رہا تھا اور نثار کی دشمنی سے بچا بھی رہا تھا۔

ایمان علی بظاہر بے ایمانی مگر بے ایمانی سے حاصل کیے ہوئے پیسوں سے شبو کی بیمار کا علاج کر رہا تھا۔ اس کے گھر والوں کو تین وقت کی روٹیاں کھلا رہا تھا اور اپنی بہن کی ڈولی اٹھانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

پھر اسے ریشم کی الجھنوں کا احساس ہوا کہ وہ بھائی کے خلاف تھی اور گھر آئے ہوئے اجنبی سے ہمدردی کر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی ماں سے بچھڑ جائے اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بھائی مجرم کہلائے اسی لیے وہ اپنے طور پر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔

ریشم جو کچھ جانتی تھی وہ نجو سے کہہ رہی تھی اور شہریار سن رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

وہ ایک نئی کہانی لکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ غریبی اور محتاجی کے متعلق جب بھی کہانیاں لکھی جاتی ہیں تو ان کہانیوں میں یہی ہوتا ہے کہ بیچارے کس طرح کپڑوں کو ترستے ہیں اور کس طرح ان کے بچے بھوک سے بلکتے ہیں۔ مگر شہریار نئے تجربات سے دوچار ہو رہا تھا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ کس طرح مجبوریاں ہزاروں ایمان علی کو بے ایمان بنا دیتی ہیں۔ پھر بھی غریبوں کا ایمان باقی رہتا ہے۔

شہریار نے فیصلہ کیا کہ فی الحال وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرے گا۔ یعنی کسی کو یہ نہیں بتائے گا کہ اس کی یاد داشت واپس آ گئی ہے ابھی وہ سب کو فریب دے گا۔ اور یہ دیکھے گا کہ اس کے ذریعہ کتنے غریبوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور اس کی یادداشت کھونے کے باعث کیسے کیسے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔

شہریار نے فیصلہ کر لیا کہ ریشم کو بھی نہیں بتائے گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ وہ مظلوم ہے۔ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ لہذا وہ اس سے ہمدردی کی خاطر اس کے قریب رہے گی اور وہ پھول کے قریب ہوتا جائے گا۔

وہ بڑی دیر تک اپنی سوچ میں گم رہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ ریشم اور نجو کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے کوئی آہٹ سننے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر

دیکھا۔وہ دونوں نہیں تھیں۔کمرہ خالی تھا۔اسی وقت دوسرے کمرے سے ایمان علی کی آواز آئی۔

''میں شبو کی دوائیاں لانے جا رہا ہوں۔اب میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں بھائی جان کا بھی علاج کراؤں گا اور ابھی جا کر انہیں خیراتی اسپتال سے لے آؤں گا۔''

ریشم کی آواز سنائی دی۔

''بھائی جان ! برا نہ مانیے گا۔اس بے ایمانی کے پیسوں سے کتنوں کا علاج ہو رہا ہے۔اور کتنوں کو روٹیاں مل رہی ہیں۔لیکن آپ شہریار صاحب کی بھلائی کے لیے بھی سوچیے۔کیا وہ اپنی ماں سے کبھی نہیں ملیں گے۔''

''آہستہ بولو ریشم۔اگر وہ ہوش میں آ گیا اور اس نے تمہاری باتیں سن لیں تو میں اس کی نظروں سے گر جاؤں گا۔میں اسے دوست بنا کر یہاں لایا ہوں اور ایک دوست کی طرح اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔ہاں میری خودغرضی صرف اتنی ہے کہ میں ایک بیٹے کو ماں سے جدا کر رہا ہوں اور یہ صرف اس وقت تک ہے۔جب تک کہ وہ خود کو نہیں پہچانتا۔''

پھر اس نے چونک کر بہن سے کہا۔''ارے ہاں ابھی تم نے ڈاکٹر کے سامنے کہا تھا کہ اس نے تمہیں پہچان لیا تھا۔وہ کیسے جانتا ہے کہ تمہارا نام ریشم ہے۔''

''مم میں کیا جانوں۔'' وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔''میرے خیال سے اس نے کالج کی میگزین میں میری تصویر کبھی دیکھی ہوگی۔میرا نام بھی پڑھا ہوگا۔''

''تعجب ہے !'' ایمان علی نے کہا۔''اسے اپنی ماں کی یاد نہیں آئی۔اپنا گھر اور اپنا نام یاد نہیں آیا۔اس نے کسی کو نہیں پہچانا صرف تمہیں پہنچان لیا' کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں یہ ، یہ سب نفسیاتی الجھنیں ہیں۔کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے کہ وہ سب کچھ کیسے بھول گئے اور میری تصویر کیسے یاد رہ گئی۔بھائی جان اگر چاہیں تو انہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جا کر اس کی یادداشت واپس لا سکتے ہیں۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔پہلے میں نثار سے سودے کی پوری رقم وصول کروں گا۔شبو کا علاج کراؤں گا۔

بھائی جان کا علاج کراؤں گا۔تمہاری شادی کے لیے گہنے اور کپڑے بنواؤں گا۔اس کے بعد وعدہ کرتا ہوں کہ ایک بچھڑے ہوئے بیٹے کو اس کی ماں سے ملا دوں گا۔اس سے پہل تم مجھ ایمانداری کا سبق نہ پڑھاؤ۔میں جا رہا ہوں۔یہ دروازے اندر سے بند کر لو۔نثار آئے تو دروازہ نہ کھولنا اس سے کہہ دینا کہ مجھ سے رات کو ملاقات ہوگی۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔شہریار نے دروازہ بند کرنے کی آواز سنی۔پھر نجو کی آواز سنائی دی۔

''ریشم ! ایک بات پوچھوں۔؟''

''پوچھو''

''سچ سچ بتاؤ گی۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ مجھے جھوٹ بولنا پڑے۔''

''کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں ریشم ! جنہیں لڑکیاں دل میں چھپا کر رکھتی ہیں۔اگر کبھی وہ باتیں ظاہر ہونے کا خدشہ ہوتا ہے تو جھوٹ بول کر ٹال دیتی ہیں۔میرا دل نہیں مانتا کہ شہریار صاحب نے تمہاری تصویر دیکھی ہوگی۔دیکھو ،مجھ سے نہ چھپاؤ۔سچ مچ بتاؤ کیا پہلے کبھی تم ان سے مل چکی ہو۔''

''نن نہیں تو ،یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو ،میں ،میں بھلا ان سے کہاں مل سکتی ہوں''۔

''تمہاری گھبراہٹ یہ بتا رہی ہے کہ تم مجھ سے حقیقت چھپا رہی ہو۔''

''نن نہیں نجو۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔میں تو یہ سوچ کر گھبرا رہی ہوں کہ ایسی بے تکی باتیں بھائی جان کو معلوم ہوں گی تو وہ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔وہ کتنے اعتماد سے مجھے کالج جانے کی آزادی دیتے ہیں۔تم یقین کرو میں نے بھائی جان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔''شہریار بے اختیار مسکرانے لگا۔

نجو بھاگتی ہوئی آنگن میں آ گئی۔اپنی باجی کے لیے لائے ہوئے پھول اس کے آنچل کی جھولی سے گر کر بکھر گئے تھے۔

وہ آنگن میں بیٹھ کر بکھرے ہوئے پھولوں کو چننے لگی۔تمام پھولوں کو آنچل میں رکھنے کے بعد وہ ایک ہاتھ

سے آنسو پونچھتی ہوئی شبو کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

ایمان علی شبو کو سہارا دیتے ہوئے بستر سے اٹھا رہا تھا۔ پھر ایمان علی گلاس میں رکھی ہوئی دوا اس پلانے لگا۔

نجو دروازے پر رک گئی تھی اور انہیں دیکھ رہی تھی۔ ایمان علی جس انداز میں اسے دوا پلا رہا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر نجو نے دل میں سوچا۔ اگر میری بہن خوش نصیب ہوتی ! اگر میری باجی سہاگن ہوتیں۔ اگر ایک محبت کرنے والا خاوند انہیں اسی طرح دوا پلاتا تو باجی کی زندگی سے کتنے صدمے ڈھل جاتے۔

کون ہے وہ مرد جو میری باجی کا ہاتھ تھامے گا ،اور انہیں سہاگن بنائے گا۔ کوئی نہیں کیا سب لوگ باجی کو ایک ذلیل عورت سمجھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔

میں باجی کی خوشیاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں۔

کس سے کہوں کہ مرد کا سہارا مل جائے تو عورت پستی میں نہیں گرتی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کبھی اپنی باجی کو دیکھ رہی تھی اور کبھی ایمان علی کی محبت اور مہربانیاں دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ کمرے میں آ کر بولی۔

''دیکھو باجی ، میں تمہارے لیے کتنے سارے پھول لائی ہوں۔ ریشم کہتی ہے کہ پھولوں کو دیکھ کر آپ تازگی محسوس کریں گی۔''

اس نے تمام پھول بہن کی گود میں ڈال دیے۔ شبو نے ایک پھول کو اٹھا کر دیکھا پھر نجو کے چہرے کو دیکھا اور بولی۔

''تو مجھ میں تازگی پیدا کرنے کے لیے آئی ہے مگر تیرا چہرہ مرجھایا ہوا کیوں ہے۔ معلوم ہوتا ہے تو ابھی رو رہی تھی۔''

''جی ،جی نہیں تو۔'' وہ آنچل سے اپنے چہرے کو پوچھنے لگی۔ ایمان علی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم ابھی رو رہی تھیں ہم سے کچھ چھپا رہی ہو۔''

وہ رونے لگی۔ نجو کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ ایمان علی نے شبو کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''شبو ابھی میں نے تمہیں سمجھایا ہے کہ کسی بات کا غم نہ کرو۔ ڈاکٹر نے تمہیں ہمیشہ ہنسنے بولتے رہنے کے لیے کہا ہے۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو یہ تمام دکھ درد اور پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں مجھ پر بھروسہ کرو۔'' شبو نے روتے ہوئے کہا۔

''تم پر بھروسہ ہے ایمان مگر ہم کب تک تم پر بوجھ بنے رہیں گے۔''

''ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔''

''میں ٹھیک کہتی ہوں۔ اگر بوجھ اٹھانا ہے تو صرف شبو کا بوجھ اٹھاؤ اور اسے بیاہ کر لے جاؤ۔'' نجو نے جلدی سے کہا۔

''باجی یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں ، میں نے ، میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ایمان سے شادی کروں گی۔''

''کیا۔'' وہ دونوں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ شبو جانتی تھی ایمان علی بھی جانتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شادی سے انکار کرے گی۔

نجو نے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

''باجی تمہیں سوچ سمجھ کر یہ بات کہنا چاہیے۔ اگر میں ایمان سے ہنستی بولتی ہوں تو تم اس کا غلط مطلب کیوں لیتی ہو۔''

پھر اس نے ایمان علی کو مخاطب کیا۔

''ایمان ، میں تم سے ایمان کی بات پوچھتی ہوں۔ بتاؤ کہ شادی کس عورت سے کرنا چاہیے۔''

ایمان علی نے جواب دیا۔ ''اس عورت سے جو گھر کی حیثیت کو سمجھتی ہو۔ دیکھنے سننے میں اچھی ہو اور صحیح معنوں میں محبت کی مستحق ہو۔''

''کیا میری باجی محبت کی مستحق نہیں ہیں۔'' شبو نے چونک کر کہا۔

''نجو کیا بکتی ہے۔ تو کیا کہنا چاہتی ہے۔''

''میں تم سے نہیں ایمان سے باتیں کر رہی ہوں۔ بتاؤ ایمان ! کیا میری باجی گرہستی کو نہیں سمجھتی۔ کیا خوب صورت نہیں ہیں۔ اگر انہیں ایک خاوند کی سرپرستی حاصل ہو جائے تو کیا یہ چار پیسوں کے لیے گھر سے

باہر جائیں گی۔''

''تمہاری باجی کو اگر سہارا مل جائے تو ان کی زندگی بدل جائے گی۔'' نجو نے آگے بڑھ کر کہا۔

''صرف زبان سے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔تم یہ دوائیں لا کر تین وقت کی روٹیاں کھلا کر صرف ہمدردی کر سکتے ہو۔اگر تمہیں سچی ہمدردی ہے تو میری باجی کو اپنی پناہ میں لے لو۔''

شبو نے چیخ کر کہا۔

''نجو! بکواس مت کر۔ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔'' نجو یکبارگی آگے کو جھکی اور ایمان علی کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''ایمان میری باجی بہت اچھی ہیں۔یہ نہ دیکھو کہ وہ کن راہوں سے آبلہ پا ہو کر آئی ہیں۔جو عورت اپنی بہن کے لیے اپنا خون بیچ سکتی ہے۔وہ اپنے خاوند کے لیے ایک اشارے پر جان بھی دے سکتی ہے۔میں قسم کھاتی ہوں۔میں یقین دلاتی ہوں کہ ایسی محبت کرنے والی وفادار بیوی تمہیں کہیں نہیں ملے گی۔''

ایمان علی ہکا بکا سا نجو کو دیکھ رہا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔وہ یوں ساکت بیٹھا ہوا تھا کہ اسے اپنے قدموں سے الگ بھی نہ کر سکا۔

شبو بھی اپنی بہن محبت کی عقیدت اور دیوانگی سے متاثر ہو گئی تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح اسے خاموش رہنے کے لیے سمجھائے اور وہ خاموش رہنے والی نہیں تھی،بولتی جا رہی تھی۔

''ایمان ،تمہارے دل میں ایمان ہے۔تم دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ جاتے ہو۔ان کے لیے جیب خالی کر دیتے ہو لیکن ہر جگہ پیسہ کام نہیں آتا صرف مرد کا مضبوط سہارا کام آتا ہے اگر تمہیں باجی کی بدنامی سے اپنی بدنامی کا خدشہ ہے تو صاف صاف کہہ دو پھر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی پھر تم اپنی مرضی سے سخی داتا کی طرح آیا کرنا اور ہمیں حسب توقع خیرات دیتے رہنا۔مگر یہ خیال کبھی دل میں نہ لانا کہ نجو شادی کرے گی۔میں شادی نہیں کروں گی۔خدا کی قسم جب تک باجی کی قدر کرنے والا کوئی نہیں آئے گا۔اس وقت تک میں اس دنیا کے ہر شخص سے نفرت کرتی رہوں گی۔نفرت کرتی رہوں گی۔''

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

ایمان علی کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ایک طرف وہ نجو کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ دوسری طرف انسانیت کا تقاضا یہ تھا کہ شبو کا سہارا بن جائے۔

شبو کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگی۔

''نجو! مس جانتی ہوں۔ تیرا دل میری خوشیوں کے لیے کس طرح تڑپتا ہے۔ ہر لڑکی اپنے سہاگ کا سپنا دیکھتی ہے مگر تیرا دل اور دماغ مجھے سہاگن بنانے کے لیے سوچتا رہتا ہے۔

ہاں جب میں تیرے لیے سوچتی ہوں تو تجھے بھی حق پہنچتا ہے کہ تو میرے لیے سوچتی رہے لیکن اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے ایمان علی کو دھوکا دینا بہت بڑی ذلت ہے۔ جو ہماری اتنی مدد کرتا ہے تو اسے ایسا پھول پیش کرنا چاہتی ہے جس کی خوشبو اڑ چکی ہے۔''

نجو نے سر اٹھا کر کہا۔

''باجی آپ مجھ سے ذہین ہیں۔ آپ خود کو ایسا کھوٹا سکہ بنا کر پیش کر رہی ہیں جسے کوئی اٹھا کر جیب میں نہیں رکھتا آپ خود کو ایسا پھول کہتی ہیں جس کی خوشبو اڑ چکی ہے۔ نہیں باجی! عورت کے پیار اور ایثار کی خوشبو کبھی نہیں مرتی۔ یہ اس کے خاوند کی محبت سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بچوں کے بچوں تک قائم رہتی ہے۔ خوشبو کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اگر خوشبو سے آپ کی مراد یہ ہے کہ اب آپ جوان نہیں رہیں۔ بوڑھی ہو گئی ہیں تو پھر دو سال بعد مجھے بھی بوڑھی ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ آپ مجھ سے صرف دو سال بڑی ہیں۔ نہیں باجی ایمان کی نظروں سے خود کو گرانے کی کوشش نہ کریں آپ کتنی حسین ہیں، کتنی جوان ہیں، کتنی اچھی ہیں۔ یہ میں آپ کے ظاہر سے بھی آپ کو جانتی ہوں اور آپ کے باطن سے بھی آپ کو پہچانتی ہوں۔ ایک بہن سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں جان سکتا۔''

ایمان علی نے سر ہلا کر کہا۔

''تم دونوں اپنی جگہ درست ہو۔ نجو ٹھیک کہتی ہے کہ تم کھوٹا سکہ نہیں ہو اور تم بھی ٹھیک کہتی ہو کہ پہلے ایک سال سے تم جو ناجائز روزی حاصل کر رہی ہو اس کے پیش نظر نجو کو چاہیے کہ وہ مجھے فریب نہ دے۔

لیکن کسی نہ کسی کو فریب تو دینا ہی ہوگا۔ کس نہ کسی طرح تمہارے لیے ایک ایسے خاوند کا سہارا تلاش کرنا ہو

گا جو تمہاری پچھلی غلطیوں سے بے خبر ہو۔ وہ تمہیں اور تمہارے بچے کو بیوہ اور یتیم سمجھ کر قبول کرلے گا۔ یہ دنیا ایک فریب کا گھر ہے۔ یہاں دو ہی حقیقتیں ہیں فریب دو یا فریب کھاؤ' اگر کسی کو فریب نہیں دو گے تو خود فریب کھاتے رہو گے میرے بھائی نے اور میری بھابی نے مجھے اور ریشم کو اس لیے گھر سے الگ کر دیا کہ ان دنوں میں ایماندار تھا۔ اگر آج کی طرح بے ایمانی سے موٹی رقمیں حاصل کرتا تو وہ مجھے اور میری بہن کو سر پر بٹھا کر رکھتے۔ یہ جو بے ایمانی کے پیسے میری جیب میں ہیں۔ اس سے تمہاری دوائیں آ رہی ہیں۔ دونوں گھروں میں چولہے جل رہے ہیں اور اب جو بے ایمانی کے پیسے آنے والے ہیں۔ ان سے میری بہن کا جہیز تیار ہوگا اور تعلیم مکمل ہوگی۔

اب سوچو کہ اگر میں بیک وقت شہر یار اور نثار سے فریبی چالیں نہ چلتا تو آج ہمارا کتنا برا حشر ہوتا۔ اس محلے کا اس شہر کا اور اس دنیا کا کوئی شخص ازراہ کرم تمہارے لیے دوائیں نہ لاتا ہمارے گھروں میں چولہا نہ جلاتا اور میری ٹیکسی کی قسطیں ادا نہ کرتا۔

جب کوئی سیدھی طرح تمہیں دلہن بنانے نہیں آتا ہے تو پھر کیوں نہ ہم اسے اندھیرے میں رکھیں۔ اس سے تمہاری اصلیت چھپائیں اور اسے تمہارا ایک مضبوط سہارا بنا دیں۔ جب تمہارا ایک گھر ہوگا۔ خاوند کی محبت ملے گی اور تم پوری وفاداری اور دیانتداری سے اس کے ساتھ زندگی گزارو گی تو اس چھوٹے سے فریب کو بھول جاؤ گی

یہ فریب میں نہیں کھاؤں گا۔ کیونکہ جان بوجھ کر نہ تم مجھے دھوکا دو گی نہ میں دھوکا کھاؤں گا۔ میں تمہارے لیے ایک خاوند تلاش کروں گا۔ تم اچھی طرح کھاؤ پیو اور تندرست ہو جاؤ۔ اس وقت تک میں ایسا شکار کھیلوں گا ایسے شخص کو پکڑ کر لاؤں گا جو ساری عمر تم سے محبت کرے گا اور تمہارا محافظ بنا رہے گا۔''

شبو اور نجو دونوں بہنیں آنکھیں پھاڑے خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں وہ اس کے مشورے کی مخالفت نہ کر سکیں اور کیسے کرتیں۔ زندگی کی ٹھوکروں نے سمجھا دیا تھا کہ ایمان علی سچی اور کھری باتیں کرتا ہے اور جو کہتا ہے اسے کر گزرتا ہے۔

☆☆☆☆

سب نے دوپہر کا کھانا شبو کے ہاں کھایا۔ ریشم اپنے گھر کا پکایا ہوا سالن اس کے ہاں لے آئی تھی۔ یہ ایمان علی کا مشورہ تھا کہ سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے۔ اس مشورے کے پیچھے ایک خاص مقصد تھا۔

ایک ساتھ کھانا کھانے کا مقصد یہی تھا کہ شہریار بھی اس کھانے میں شریک ہوتا۔ شبو اسے دیکھ لیتی اور وہ شبو کو دیکھ لیتا۔ ایمان علی نہیں جانتا تھا کہ پچھلی رات جب وہ شبو سے باتیں کر رہا تھا۔ اس وقت شہریار اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے شبو کو بھی دیکھا تھا۔ ان کی باتیں بھی سنی تھیں اور یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ بھوک اور مجبوریاں شبو کو کن راہوں پر لے جا رہی ہیں۔

اس نے بہت کچھ سنا تھا۔ اس کی دکھ بھری زندگی کو سمجھا تھا اور جب سچائی سمجھ میں آ جاتی ہے تو پھر شبو جیسی عورتوں سے نفرت نہیں ہوتی۔ ان سے محبت ہو یا نہ ہو مگر ہمدردی ضرور ہوتی ہے۔ شہریار کو بھی شبو سے اتنی ہمدردی تھی کہ وہ اپنی دولت کے سہارے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ براہ راست مدد کرتا تو اس کی اصلیت ظاہر ہو جاتی سب اسے دولت مند سمجھ کر سر پر بٹھاتے اور اپنی غریبی کے باعث جو چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کرتے ہیں اسے اس کا علم نہیں ہوتے دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو غریب ظاہر کر رہا تھا۔

شبو کے کمرے میں ایک بڑی سی دری بچھائی گئی تھی۔ اس پر بڑا سا دسترخوان تھا اور دسترخوان پر دو قسم کا سالن، روٹیاں، چاول اور سلاد وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ جب شہریار اس کمرے میں آیا تو ایمان علی نے اس سے کہا۔

''تم نجو کو تو دیکھ ہی چکے ہو۔ یہ شبو ہے نجو کی بڑی بہن یہ دیا سلائی کی ایک فیکٹری میں کام کرتی تھی اور اتنے بڑے کنبے کو سنبھالتی تھی۔ پچھلے دنوں کام چھوٹ گیا ہے۔ آج کل یہ بیکار بیٹھی ہے۔ مجھ سے جو بن پڑتا ہے۔ میں ان کی مدد کرتا ہوں۔''

ایمان علی نے درست کہا تھا۔ وہ کبھی دیا سلائی کی فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ مگر یہ غلط کہا کہ آج کل بیکار ہے۔ ایک سال پہلے ہی اس کی ملازمت ختم ہوگئی تھی۔ ایک سال تک وہ کیا کرتا رہی۔ اس بات کو ایمان علی نے

پردے میں رکھا۔شہر یار نے مسکرا کر شبو سے کہا۔

''آپ کی بڑی ہمت ہے۔ ایک عورت ہو کر اتنے لوگوں کا پیٹ پال رہی ہیں۔آج کل آپ کیا کر رہی ہیں۔''

شبو اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔پریشان ہو کر ایمان علی کو دیکھنے لگی۔ایمان علی نے جلدی سے کہا۔

''آج کل یہ دوسری ملازمت تلاش کر رہی ہے۔جب تک ملازمت نہیں ملے گی میں اس کی مدد کرتا رہوں گا۔''

وہ سب دستر خوان کے اطراف بیٹھنے لگے۔شہر یار نے شبو کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کاش کہ میں بھی کسی قابل ہوتا اور آپ کے کسی کام آتا۔''

شبو نے سر جھکا کر کہا۔

''آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے یہی میرے لیے بہت ہے ورنہ لوگ تو زبانی ہمدردی بھی نہیں کرتے۔''

شہر یار کے سامنے دستر خوان کے دوسری طرف ریشم اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی شہر یار نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو زبانی ہمدردی تو کیا نظر اٹھا کے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔''

ریشم نے جھکتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔پھر اس سے نظریں ملتے ہی جلدی سے پلکیں جھکا لیں۔

نجو اس کے بائیں طرف بیٹھی ہوئی تھی۔اس نے اچانک ہی کہا۔

''ایمان کیا تم جانتے ہو۔شہر یار صاحب کسی لڑکی سے محبت کرتے ہیں۔''

ریشم کے چہرے پر ایسی سرخی آ گئی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔اس کے ہاتھ میں نوالہ کانپنے لگا۔

ایمان علی نے نجو کو گھور کر دیکھا۔وہ شہر یار کو شبو سے وابستہ کرنا چاہتا تھا۔نجو اس کے دل کی بات نہیں جانتی تھی۔اس لیے محبت کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

شہر یار نے ایک اداس مسکراہٹ سے کہا۔

''میرے محبت کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں ہے۔''

وہ سوال ایک تیر کی طرح ریشم کے دل میں ترازو ہو گیا اس سے وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ بھائی اسے جبراً بٹھا لیتا۔ یوں بھی کھانے کے دوران اٹھنا بد اخلاقی ہے۔ ایمان علی نے شہریار سے پوچھا۔

''وہ کون لڑکی ہے۔''

شہریار نے ایک سرد آہ بھری۔

''میں خود کو نہیں پہچانتا ہوں۔ پھر اس لڑکی کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔''

ایمان علی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''اوہو تھوڑی دیر کے لیے میں بھول گیا تھا کہ تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو وہ لڑکی بھی تمہارے ذہن سے مٹ گئی ہو گی لیکن تمہیں یہ کیسے یاد آیا کہ تم کسی لڑکی سے محبت کرتے تھے۔''

اس نے جواب دیا۔

''مجھے کبھی خوابوں میں یا تصورات میں دو خوب صورت سے ہاتھ نظر آتے ہیں اور وہ ہاتھ مجھے ایک پھول پیش کرتے ہیں۔ یہ بات میں نے نجو کو بتائی نجو نے یہ کہا ہے کہ میں پہلے کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا اس لیے وہ میرے خیالوں میں آتی ہے۔''

''نجو تو پاگل ہے۔'' ایمان علی نے کہا- ''اس کی کھوپڑی میں جو الٹی سیدھی بات آتی ہے بغیر سوچے سمجھے بول دیتی ہے اور میں تمہارا گہرا دوست ہوں۔ تم مجھے بھول گئے ہو مگر میری یادداشت محفوظ ہے۔ میں تمہیں نہیں بھول سکتا دیکھو کل تمہیں مصیبت میں دیکھ کر اپنے گھر لے آیا۔ اگر تم میرے دوست نہ ہوتے تو میں تمہیں فٹ پاتھ پر چھوڑ آتا۔ کتنے ہی لوگ فٹ پاتھ پر رہتے ہیں۔ تم بھی وہاں رہتے مگر میں کسی لالچ سے تمہیں نہیں لایا ہوں۔ محض دوستی نبھا رہا ہوں۔''

ریشم نے بھائی کے اس جھوٹ پر اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ شہریار نے سر ہلا کر کہا۔

''مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے۔ اگر تم میرے پرانے دوست ہو تو میری پچھلی زندگی کے متعلق بتاؤ۔''

ایمان علی نے کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تم کسی لڑکی سے محبت نہیں کرتے تھے اگر کرتے تو مجھ جیسے دوست سے کبھی نہ چھپاتے آج سے ایک برس پہلے تم اس شہر میں آئے تھے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو تم نے بتایا کہ تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا ہے۔ میں نے تمہیں کام سے لگا دیا۔ تم دن کو ٹیکسی چلاتے تھے اور رات کو ایک گیراج میں سوتے تھے ایک ہفتہ پہلے میں تم سے ملنے گیا تو تمہاری ٹیکسی کے مہاجن نے بتایا کہ تم جھگڑا کر کے اپنا سامان لے کر کہیں چلے گئے ہو میں تمام شہر میں تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ کل رات تمہیں اس حالت میں پایا اور یہاں لے آیا۔''

ایمان علی نے بہت سوچ سمجھ کر یہ کہانی بنائی تھی۔ شہر یار کا سب کچھ سیلاب میں بہا دیا تھا اور اسے دنیا میں تنہا و بے یار و مددگار کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کو تلاش کرنے کا خیال دل میں نہ لائے۔

شہر یار نے پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔''

ماں باپ کے نام پر ریشم نے بے اختیار بھائی کی طرف دیکھا۔ بھائی نے صاف جھوٹ کہہ دیا۔

''تمہارا کوئی نہیں ہے۔''

شہر یار اسے صاف الجھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا

''میں کب تک تم پر بوجھ بنا رہوں گا۔ اب تو میں کسی قدر صحت یاب ہو گیا ہوں۔ مجھے اس مہاجن کے پاس لے چلو جس کی ٹیکسی میں چلاتا تھا۔ میں پھر ٹیکسی چلاؤں گا۔''

اس کے گھر سے نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ جاتا اور ایمان علی کو ملنے والی رقمیں ڈوب جاتیں۔ اس نے کہا

''تم ابھی محنت کرنے کے قابل نہیں ہو۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔''

''اچھا تو چار روز کے بعد مہاجن کے پاس لے چلنا۔''

’’وہ مہاجن تم سے سخت ناراض ہے۔تمہیں اپنی گاڑی نہیں دے گا۔میرے ہوتے ہوئے تمہیں کس بات کی فکر ہے۔تم کھاؤ پیو اور یہاں آرام سے رہو۔تم بھول گئے ہو کہ اس شہر میں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔میرا خیال ہے کہ انہوں نے ہی تم پر حملہ کیا تھا تمہیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔تقدیر سے تم بچ گئے مگر اپنی یادداشت کھو بیٹھے۔‘‘

’’مگر میں دشمنوں کے ڈر سے کب تک یہاں چھپا رہوں گا۔‘‘

’’کم از کم ایک ماہ تک باہر نہ نکلو۔اس کے بعد ہم یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر چلے جائیں گے۔وہاں تمہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔تم بے فکری سے ٹیکسی چلانا۔‘‘

’’کیا تم میری خاطر یہ شہر چھوڑ دو گے۔‘‘

’’ہاں کچھ تمہاری خاطر اور کچھ شبو کی خاطر ۔یہ محلے والے بیچاری شبو کو خوامخواہ بدنام کرتے ہیں۔یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔‘‘

شہر یار نے شبو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

’’آپ تو بہت اچھی ہیں۔پھر لوگ بدنام کیوں کرتے ہیں۔‘‘

وہ سر جھکا کر بولی۔

’’جس عورت کا کوئی سرپرست نہ ہو کوئی سہارا نہ ہو۔اسے دنیا والے کسی نہ کسی بہانے بدنام کرتے رہتے ہیں۔‘‘

ایمان علی نے کہا

’’شبو ٹھیک کہتی ہے۔شہر یار تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔اگر دوسرے شہر جا کر تم شبو کا سہارا بن جاؤ تو تمہیں بھی ایک اچھا گھر اور محبت کرنے والی شبو مل جائے گی۔‘‘

یہ بات سنتے ہی ریشم کے ذہن میں دھما کا سا ہوا۔اسے یوں لگا جیسے اس کا بھائی اس کی خوشیاں چھین کر اس کی جھولی میں ڈال رہا ہے۔اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر شہر یار کو دیکھا۔شہر یار سر جھکائے سوچ رہا تھا اور شبو شرما کر اپنے سر پر آنچل رکھ رہی تھی۔

ایمان علی شبو کی طرف سے کہہ رہا تھا۔

''محلے والے یہ بھی بدنام کرتے ہیں کہ یہ جو دو بچے ہیں یہ شبو کے ہیں۔ حالانکہ یہ اس کی مرحوم بہن کے ہیں۔تم ہی سوچو جب شبو کی شادی نہیں ہوئی ہے تو بچے کہاں سے آ جائیں گے۔''

شہر یار نے جواب دینے سے پہلے ریشم کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔اس کے چہرے کی افسردگی بتا رہی تھی کہ وہ لٹ رہی ہے۔اجڑ رہی ہے اور اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہو رہا ہے۔

ایمان علی نے کہا۔

''شہر یار جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لو کہ انسانیت بڑی چیز ہے۔ہم جو چند روز اس دنیا میں رہنے کے لیے آئے ہیں تو اس چند روزہ زندگی میں کتنے انسانوں کے کام آ سکتے ہیں کتنوں کا دکھ بانٹ سکتے ہیں اور شرافت سے ایک لڑکی کا ہاتھ تھام کر کتنوں کا سہارا بن سکتے ہس۔تم چاہو تو اس گھر کی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ یہ شریف ہے اور شریف عورت کی طرح ایک مجازی خدا کے قدموں میں زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ایسے میں تمہارا فیصلہ کیا ہو گا۔

سوال ایسا تھا کہ شہر یار کو پسینہ آنے لگا۔

پہلے اس نے سوچا تھا کہ بڑی خوب صورتی سے سمجھا بجھا کر انکار کر دے گا۔مگر وہاں سوال تھا ایک ایسی عورت کی زندگی سنوارنے کا جو غلط راستہ چھوڑ کر شریفانہ زندگی گزارنا چاہتی ہے۔اگر وہ شادی سے انکار کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ایک عورت کو اپنے ایک انکار سے پھر گناہوں کی دلدل میں گرا رہا ہے۔

وہ غریبوں کی زندگی کا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ کرنے والا مصنف چکرا کر رہ گیا تھا۔ایسے وقت ایسی الجھن سے نکلنے کے لیے وہ اپنی دولت کا سہارا بھی لے سکتا تھا۔شبو کو سہارا دینے کے لیے بیس پچیس لاکھ کی مدد کر سکتا تھا مگر اس رقم میں شبو کو کوئی لالچی خاوند مل سکتا تھا تمام عمر چاہنے والا جیون ساتھی نہ ملتا۔ یہ سمجھنا کہ روپے سے دال روٹی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے درست ہے۔لیکن عورت کی زندگی میں صرف دال روٹی نہیں ہوتی ایک محبت کرنے والے مرد کے سائے میں زندگی گزارنے کی شدید آرزو ہوتی ہے۔

شہر یار کے دل میں خیال آیا کہ ایمان علی انسانیت کا واسطہ دے رہا ہے۔خود انسانیت کا مظاہرہ کرنے

کے لیے شبو کا ہاتھ کیوں نہیں تھام لیتا۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ نجو کو چاہتا ہے اس لیے شبو سے شادی نہیں کرسکتا اور اسی لیے شبو کا بوجھ اس پر ڈال رہا ہے۔

'میں بھی تو ریشم کو چاہتا ہوں۔ اتنا چاہتا ہوں کہ تقدیر بھی میرا ساتھ دے رہی ہے اور مجھے بھٹکاتے ہوئے اس کے گھر تک لے آئی ہے۔ میں اپنی محبت کا گلا کس طرح گھونٹ دوں۔ کس طرح شبو کا ہاتھ تھام لوں۔ کیا میں بھی ایمان علی کی طرح شبو کا بوجھ اٹھا کر کسی دوسرے کے کاندھے پر رکھ دوں۔ کسی ایسے شخص کو پکڑ کر لے آؤں جو شبو کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو اور راضی خوش اسے قبول کرلے۔'

اس دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے کاندھے کا بوجھ دوسرے کے کاندھے پر ڈالتا ہے۔

شہریار نے سوچا یہ ٹھیک ہے کہ ایمان علی یہ تمام چالیں شبو کی بھلائی کے لیے چل رہا ہے اور اسے دوست کہہ کر بے وقوف بنا رہا ہے پھر میں اسے یہ احساس کیوں نہ دلاؤں کہ اس کا دوست اس کی بہن سے محبت کرتا ہے۔ اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ڈھکے چھپے انداز میں ایمان علی کو اس کی محبت کا علم ہوجائے۔ اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ایمان شبو بہت اچھی ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ کوئی بھی شریف آدمی اسے اپنے گھر کی عزت بنا سکتا ہے۔ میں بھی ایسا کرسکتا ہوں اور تم بھی شبو کا ہاتھ تھام سکتے ہو کیونکہ یہ نیکی ہے اور کوئی بھی نیکی کرسکتا ہے لیکن جب تمام عمر نبھانے کی بات آتی ہے تو لڑکی پسند ہونے کے باوجود سوچنے کی مہلت دی جاتی ہے' میں بھی مہلت چاہتا ہوں۔ میرے دماغ میں ایک پھانس اٹکی ہوئی ہے۔ پہلے میں اسے نکالنا چاہتا ہوں۔''

ایمان علی نے پوچھا۔

''کیسی پھانس۔ مجھے بتاؤ میں تمہاری مشکل حل کروں گا۔''

شہریار نے جواب دیا۔

''وہ پھانس دراصل ایک پھول ہے۔''

ریشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ شہریار نے اس سے انجان ہو کر کہا۔

''ایمان تم کہتے ہو کہ تم میرے متعلق سب کچھ جانتے ہو۔مگر بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو میں نے تمہیں نہ بتائی ہوں تمہارے کہنے کے مطابق ہماری دوستی ایک سال پرانی ہے۔مگر کچھ راز ایسے بھی ہوتے ہیں جو بچپن کے دوستوں کو بھی نہیں بتائے جاتے۔ان میں سے ایک محبت کا راز ہے۔ہمیں جس لڑکی سے محبت ہوتی ہے۔اس کی عزت بھی ہمیں عزیز ہوتی ہے اگر کس دوست س ذکر کریں تو وہ لڑکی بدنام بھی ہوسکتی ہے۔کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں نے اس لڑکی کی محبت تم سے چھپائی ہو۔''

ایمان علی ذرا الجھ گیا۔اس نے آہستگی سے کہا۔

''ہاں ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔کیا تم خوابوں میں محض ایک پھول کو دیکھ کر ایسا سوچ رہے ہو۔''

''ہاں ،بار بار وہی خواب آئے۔وہی خیال آئے تو پھر اس کی کچھ حقیقت ہوتی ہے ۔بلکہ ابھی ایک گھنٹہ پہلے جب میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا اس وقت میں نے خواب میں ایسا منظر دیکھا جس کی سچائی کا مجھے پورا یقین ہو گیا ہے۔''

''تم نے کیا دیکھا ہے؟''ایمان علی نے پوچھا۔

''میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔اس کا چہرہ واضح نہیں تھا۔مگر یہ میں نے صاف طور سے دیکھا کہ اس کی سیاہ زلفوں میں ایک پھول کھل رہا تھا۔

ایمان علی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔وہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ اس کی بہن کے بالوں میں پھول ایسا سجتا ہے کہ سونے کے زیورات بھی کسی لڑکی کو نہ سجتے ہوں گے۔اس نے فورا" ہی اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھی اور اس کا چہرہ حیا سے تمتمار ہا تھا۔

شہریار نے دونوں بہن بھائی کی کیفیت کو دیکھا اور کہا۔

''وہ لڑکی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔میں نے اس سے پھول مانگا۔اس نے کہا۔میں یہ پھول نہیں دوں گی ۔اگر دوں گی تو بدنام ہو جاؤں گی ۔لہذا جب تک تم مجھے بیاہ کر نہیں لے جاؤ گے ۔اس وقت تک میں اپنے بالوں میں پھول نہیں لگاؤں گی۔''

ایمان علی کا دماغ سنسنانے لگا۔اس کی بہن نے بھی بالوں میں پھول لگانا چھوڑ دیا تھا۔بہن کی اجڑی

ہوئی زلفیں کہہ رہی تھیں کہ اس کا خواب سچا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا ہے۔جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پچھلی رات یہاں آیا تھا اس نے ریشم کی زلفوں میں پھول نہیں دیکھا تھا۔

ریشم وہاں مزید بیٹھ نہ سکی۔جھوٹے برتن اٹھانے کے بہانے وہاں سے چلی گئی۔

باقی جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے انہیں خاموشی سے ڈس لیا تھا۔

شبو بھی جانتی تھی نجو بھی جانتی تھی کہ پھول سے ریشم کا اور ریشم سے پھول کا گہرا رشتہ ہے۔وہ ہمیشہ ہر روز کالج جاتے وقت پھول لگایا کرتی تھی اور اب شہریار کے خواب کے مطابق اس نے واقعی بالوں میں پھول لگانا چھوڑ دیا تھا۔

پھر وہ جھوٹے برتن اٹھا کر جس انداز سے منہ چرا کر گئی تھی اس سے صاف پتا چلا رہا تھا کہ شہریار کے خواب میں آنے والی لڑکی وہی ہے۔

ایمان علی گم صم بیٹھا ہوا تھا۔وہ بھی انہی باتوں پر غور کر رہا تھا۔شہریار نے جو کچھ کہا وہ خواب تھا۔لیکن بہن کا حیا سے تمتماتا ہوا چہرہ اس کی ویران زلفیں اور اس کے منہ چھپانے کا انداز اس خواب کو حقیقت بنا رہا تھا۔

ایمان علی کی حالت کچھ عجیب سی ہوگئی تھی۔اگر عام حالات میں کوئی نوجوان اس کے سامنے اس کی بہن سے محبت ظاہر کرتا تو وہ اس وقت نوجوان کا گریبان پکڑ لیتا اور اسے مار پیٹ کر' دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔

لیکن اسے گھر سے کیسے نکالتا۔

شہریار اس کے لیے روپے پیدا کرنے کی مشین تھی۔

ابھی جو دسترخوان پر بہترین کھانا کھایا گیا تھا۔وہ شہریار کے پیسوں سے تھا اور اس دسترخوان پر بیٹھ کر وہ خوشبو کے علاج کے لیے اسے کسی کی دلہن بنانے کے لیے اپنی بہن کو سہاگن بنانے کے لیے جتنے خواب دیکھ رہا تھا۔وہ تمام خواب شہریار کے دم قدم سے تھے۔

ایمان علی اپنے محسن اور اپنے ان داتا کا گریبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔اسے گھر سے نکال سکتا تھا۔گھر آئی ہوئی دولت کو ٹھوکر نہیں مار سکتا تھا۔بلکہ شہریار کی ٹھوکر کھا سکتا تھا۔کیونکہ دسترخوان پر بیٹھا اس کا نمک کھا رہا تھا۔کسی کا نمک کھانے اور ٹھوکر کھانے میں ایک ذرا سا فرق ہے۔ٹھوکر ایک میٹھی ڈش کی طرح ہے جو نمک کھانے کے بعد

کھائی جاتی ہے ۔

بے ایمانی اتنی آسانی سے راس نہیں آتی۔

وہ شہر یار کی طرف بے بسی سے دیکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اس نے باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ ریشم وہاں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے چونکتے ہوئے سر کو اٹھایا۔ بھائی سے نظریں ملتے ہی وہ گھبرا سی گئی۔ جلدی برتنوں کو ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''یہاں آؤ!'' اس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا اور وہاں سے جانے لگا۔

ریشم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔



ایمان علی اپنے مکان کا دروازہ کھول کر اندر آیا اور کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

اس کے دماغ میں یہی ایک بات پک رہی تھی کہ شہر یار میری بہن کے خواب کیوں دیکھتا ہے۔ یہ بات وہ شہر یار سے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ پچھلی زندگی کو بھول گیا تھا۔ اسی لیے ریشم کو بھی بھول گیا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ کوئی لڑکی اپنی زلفوں میں پھول لگاتی ہے اور، اور آج کے تازہ خواب میں اس لڑکی نے شہر یار سے کہا تھا کہ جب تک مجھے بیاہ کر نہیں لے جاؤ گے۔ میں اپنے بالوں میں پھول نہیں لگاؤں گی۔

اور ایمان علی دیکھ رہا تھا کہ اس کی بہن نے واقعی پھول لگانا چھوڑ دیا ہے۔

پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ شبو کو شہر یار کے پلے باندھے گا۔ باقاعدہ دونوں کا نکاح پڑھائے گا۔ شبو کے مہر کی رقم کم از کم پچاس ہزار روپے لکھوائے گا۔ تاکہ شہر یار کی یادداشت واپس آئے اور وہ اپنی ماں کے پاس واپس جائے تو اس کی ماں شبو کو اپنی بہو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر وہ تسلیم نہیں کرے گی اور شہر یار بھی اسے چھوڑنا چاہے گا تو انہیں مہر کی رقم پچاس ہزار روپے ادا کرنے پڑیں گے۔

اس نے دروازے پر آ کر باہر دیکھا۔ ریشم ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً" شرما رہی تھی۔ گھبرا رہی تھی

۔اس کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل میں چور ہے اور وہ بھائی کا سامنا کرنے سے کترا رہی ہے

وہ پھر کمرے میں آ گیا اور میز پر رکھی ہوئی موٹی موٹی کتابوں کو دیکھنے لگا۔

وہ بھاری بھرکم کتابیں بتا رہی تھیں کہ اس کی بہن کتنا پڑھتی ہے اور کتنا سمجھتی ہے۔اب وہ نادان بچی نہیں ہے کہ اس اچھے برے کی پہچان کرائی جائے۔تعلیم حاصل کرنے والی لڑکی کم از کم اس بات کی حقدار ہوتی ہے کہ باپ یا بھائی اس کے مستقبل کا فیصلہ اس کی مرضی سے کریں۔

اور بہن کی مرضی کسی حد تک معلوم ہو چکی تھی۔

ویسے بھائی نے بھی ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ وہ بہن کو جتنی تعلیم دلا رہا ہے اسے سسرال بھی اتنا ہی اونچا ملے۔ ایک محبت کرنے والا اور جان دینے والا خاوند ملے اور وہ ہمیشہ مسرتوں سے کھیلتی رہے۔

شہر یار بھی دولت مند تھا' خوبرو تھا' ریشم کو اتنا چاہتا تھا کہ سب کچھ بھولنے کے باوجود اس کی دھندلی دھندلی یاد میں بھٹک رہا تھا' اتنی محبت کرنے والا تو کسی نصیب والی کو ہی ملتا ہے۔

پھر کیا بات تھی کہ ایمان علی شش و پنج میں مبتلا تھا۔

کیا سوچ رہا تھا۔کیوں جھنجھلا رہا تھا۔

بہت دیر سوچتے رہنے سے اس کی سمجھ میں آیا کہ شہر یار میں کھوٹ نہیں ہے بلکہ اپنی غریبی کھٹک رہی ہے۔بہن نے اونچا گھر دیکھا ہے اور بھائی سوچ رہا ہے کہ اس اونچے گھرانے کے شایان شان کسی طرح بہن کو سہاگن بنائے گا۔مخمل والے یوں ہی تو ٹاٹ کا ٹکڑا اٹھا کر نہیں لے جائیں گے۔

اس نے سوچتے سوچتے پلٹ کر دیکھا۔ ریشم سر جھکائے دہلیز پر کھڑی تھی۔

وہ منہ پھیر کر بولا۔ ''دروازہ بند کر دو۔''

وہ اندر آئی۔گھوم کر دروازے کو بند کیا۔پھر اسی طرح دروازے کی طرف منہ کیے کھڑی رہی۔

بہن کا منہ مشرق کی طرف تھا اور بھائی کا منہ مغرب کی طرف دونوں کی پشت ایک دوسرے کی جانب تھی۔ دونوں کے درمیان گہری خاموشی تھی۔ بھائی سوچ رہا تھا کہ کس طرح مہذب انداز میں بہن کے دل کی بات

پوچھے اور بہن سوچ رہی تھی کہ یہ روز محشر ہے اس روز ڈھونڈ نے سے کسی سوال کا جواب لبوں تک نہیں آئے گا۔

پھر ایمان علی نے بڑے ہی برے انداز سے پوچھا۔ ''تم نے شہریار کا خواب سنا؟۔''

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔اس سوال کے پیچھے بہت سے جواب چھپے ہوئے تھے۔اسی لیے وہ خاموش رہی ۔ایمان علی نے کچھ دیر انتظار کیا پھر کہا۔

''یہ تم جانتی ہو کہ خاموشی کا مطلب ہاں ہوتا ہے۔تم جس بات کا جواب نہیں دو گی۔میں اسے تمہارا اقرار سمجھ لوں گا۔لیکن بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وضاحت طلب ہوتی ہیں۔شہریار نے نادانستگی میں جو خواب سنایا ہے اس میں تمہاری زندگی کی جھلکیاں ہیں۔مجھے بتاؤ کہ تم کب سے اسے جانتی ہو۔''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں ، میں نے انہیں کالج کے سامنے دیکھا تھا۔میں نے کچھ نہیں کیا۔انہوں نے خود ہی مجھ سے باتیں کیں۔بس ایک بار باتیں کیں میں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا ہے بھائی جان۔اس کے بعد میں نے انہیں اسپتال میں دیکھا وہ اپنی یادداشت کھو چکے تھے۔انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔میں نے پہچان لیا۔مگر انجان بنی رہی، میں نے سوچا تھا کہ جس طرح وہ ساری دنیا کو بھول گئے۔اسی طرح مجھے بھی بھول چکے ہیں۔مگر ہمگر.................''

اس کی آواز بھرا گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ روتی ہوئی بولی۔''مگر میں کیا کروں۔وہ ساری دنیا کو بھول کر بھی ایک پھول کو یاد کر رہے ہیں۔میں انہیں کیسے روک سکتی ہوں۔آپ انہیں دل کی بات کہنے سے کیسے روک سکتے ہیں۔وہ بھولے ہوئے ہیں۔بھٹکے ہوئے ہیں۔آپ انہیں اور بھٹکا رہے ہیں۔ان کی والدہ سے انہیں دور کر رہے ہیں۔ان کی والدہ سے پوچھے بغیر شبو سے انہیں شادی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں آپ کہتے ہیں کہ بے ایمانی سے دولت ملتی ہے اور کتنوں کی زندگیاں سنور جاتی ہیں۔آپ یہ نہیں دیکھتے کہ کتنوں کی زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ایک ماں کی ممتا، ایک بیٹے کا مستقبل۔ان کا گھر ان کی خوشیاں سب ہی کو آپ برباد کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔آپ کی نظروں میں میری خوشیوں کی

سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اگر آپ میری خوشی پوچھیں گے تو میں یہی کہوں گی کہ شہر یار صاحب کی خوشیاں لوٹا دیجیے۔ ایک بیٹے کو اس کی ماں کے پاس پہنچا دیجیے۔ ہم بے ایمانی سے پہلے بھی زندہ تھے۔ میں وہی ایمانداری کی زندگی چاہتی ہوں۔''

ایمان علی نے گھوم کر دیکھا۔ وہ دروازے کی طرف منہ کیے رو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور کہنے لگا۔

''تم شہر یار کی بھلائی کے لیے سوچ رہی ہو۔ دوسروں سے بھلائی کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن کوئی بھی نیکی اس طرح کی جائے کہ اس سے ہمیں بھی فائدہ حاصل ہوتا رہے۔ ہم ایسا قدم کیوں نہ اٹھائیں جس سے شہر یار کا بھی فائدہ ہو اور ہماری مشکلیں بھی آسان ہو جائیں۔''

وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی ۔آنسو اس لیے پونچھنے لگی کہ شہر یار کے فائدے کی بات ہو رہی تھی۔

''ریشم شہر یار کے خواب نے اور تمہاری ہمدردیوں نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ جیسا کہ تم جانتی ہو۔ میں تمہارے لیے ہمیشہ اونچے خواب دیکھتا ہوں۔ آج میرا یہ خواب پورا ہو رہا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ شہر یار تمہارے لیے ایک بہترین جیون ساتھی ثابت ہوگا۔''

ریشم نے دم بھر کے لیے دم سادھ لیا۔

اچانک ہی کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں۔

بھائی اس کے کنورے خوابوں کی صحیح تعبیر سنا رہا تھا۔ اس نے چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں آکر بیٹھو اور جو کچھ میں کہتا ہوں اسے خوب توجہ سے سنو۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے سر کے آنچل کو گھونگھٹ بناتی ہوئی چارپائی کے سرے پر بیٹھ گئی۔

ایمان علی نے بہن کے گھونگھٹ کو دیکھا۔ اس کا گھونگھٹ بتا رہا تھا کہ وہ صحیح فیصلہ کر رہا ہے اس نے مسکرا کر کہا۔

''میں شہر یار کو اس کی والدہ تک پہنچا دوں گا لیکن ایک شرط ہے۔''

''شرط......کیسی شرط؟'' ریشم کے دل نے سوال کیا۔ لیکن وہ زبان سے نہ پوچھ سکی۔

ایمان علی نے بات آگے بڑھائی۔

''شرط یہ ہے کہ پہلے تمہاری شادی شہر یار سے ہوگی پھر میں کسی دن اسے اس کی والدہ تک پہنچا دوں گا۔''

وہ گھونگھٹ کے سائے میں سوچنے لگی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہو لیکن شرم وحیا کے باعث نہیں پوچھ سکتی ہو۔ میں اپنے طور پر سوچتا ہوں کہ تمہارے ذہن میں کسی قسم کے سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اصولاً شہر یار کی بارات اس کی کوٹھی سے آنی چاہیے۔ برسوں سے یہی رواج ہے کہ دولہا اپنے گھر سے آتا ہے۔ لیکن تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ تمہارا غریب بھائی اتنی بڑی بارات کا استقبال کر سکتا ہے یا نہیں۔

بہت سی سوچنے اور غور کرنے کی باتیں ہیں۔ دولت مند مغرور ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ شہر یار کی والدہ ہماری حیثیت سے زیادہ باراتیوں کو لے کر آئے۔ یہاں جتنے آئیں گے سب ہی بڑے لوگ ہوں گے اور ہماری غریبی کا مذاق اڑائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ جہیز کا مطالبہ ہو اور میں وہ مطالبہ پورا نہ کر سکوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ والدہ کسی قسم کا مطالبہ نہ کریں اور صرف تمہیں بہو بنا کر لے جائیں۔

لیکن ایسا کم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ۔ یہ قصے کہانوں میں بتایا جاتا ہے کہ بڑے لوگ صرف بیٹے کی پسند کو دیکھتے ہیں اور ایک کنگال بہو کو بیاہ کر لے آتے ہیں۔ اگر شہر یار کی والدہ تمہیں بہو بنا کر نہیں لے گئیں تو ہم سب زبردست نقصان اٹھائیں گے۔ جو آمدنی نثار کے ذریعے ہو رہی ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ ہم شبو کا علاج نہیں کرا سکیں گے۔

میں اپنی ٹیکسی کی قسطیں ادا نہیں کر سکوں گا۔

اور تمہارے جہیز کا سامان نہیں خرید سکوں گا۔ تمہارے لیے سونے کے زیورات نہیں بنا سکوں گا۔ یہ لڑکیوں کا رشتہ مانگنے والے تعلیم کا زیور نہیں مانگتے۔ سونے کے زیورات سے لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں۔

لہذا میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شہر یار کو دھوکا دیتا رہوں اور نثار سے آئے دن ہزاروں روپے وصول کرتا رہوں اور تمہارا جہیز پورا کر کے تمہیں کسی اچھے گھرانے میں بیاہ دوں'

دوسرا راستہ یہ ہے کہ شہر یار سے تمہاری شادی کروں جب نکاح نامہ ہمارے پاس ہوگا اور اس میں ایک

لاکھ روپے مہر کی رقم لکھی ہو گی اور جب اس کی والدہ کو اس کے رشتے داروں کو اس نکاح کا علم ہو گا تو قانوناً وہ تمہیں بہو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ نہ ہی وہ اپنی شان وشوکت دکھا سکیں گے اور نہ ہی جہیز کا مطالبہ کر سکیں گے۔

جب بڑے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے تو وہاں سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں جبراً" تمہیں ان کی بہو بنا رہا ہوں۔ نہیں یہ کوئی زبردست کا سودا نہیں ہے شہر یار تمہیں پسند کرتا ہے۔ جب وہ ماں سے ملے گا یا جب اس کی یادداشت واپس آئے گی۔ اس وقت بھی وہ تمہیں پسند کرے گا۔ لیکن وہ اس وقت تک اپنی ماں سے نہیں مل سکے گا۔ جب تک کہ تم سے شادی نہیں کرے گا۔

اب تم اچھی طرح سوچو اور فیصلہ کرو ، اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں شہر یار کو اس کی ماں تک پہنچا دوں تو پہلے تمہاری شادی ہو گی۔ شہر یار کو مذہب اور قانون کے مطابق تمہارا پابند بنایا جائے گا۔ اگر یہ منظور نہیں ہے تو میں نثار کا ساتھ دوں گا اور اس سے رقمیں وصول کرتا رہوں گا۔ اس کے بعد تم شہر یار کے لیے ہمدردی کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاؤ گی ۔ کل صبح تک تم اپنا فیصلہ نجو کو سنا دو۔ میں نجو سے پوچھ لوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ دروازے کے پاس آیا۔ ریشم پر ایک نظر ڈالی۔ پھر دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

ریشم نے اپنی جگہ سے ہٹ کر دروازے کو بند کر دیا اور سوچ کے دروازے کھولنے لگی۔

ہر دروازے سے شہر یار سہرا باندھے تنہا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے بارات نہیں تھی۔

یہ کام شہر یار کا تھا کہ وہ اپنی والدہ کو لے کر آتا اور وہ بہو پسند کرتیں یہی دستور ہے۔ اسی طرح ایک دلہن کا مان بڑھتا ہے۔

اگر کسی طرح شہر یار اپنی والدہ تک پہنچ جائے اور انہیں یہاں لے آئے تو کتنی اچھی بات ہو گی۔

وہ ایک نئے انداز سے سوچنے لگی۔

اگر شہر یار خود کو بھول کر مجھ سے شادی نہ کرے۔ اپنی تمام اگلی پچھلی زندگی کو یاد کر کے خود کو اچھی طرح پہچان کر اور خوب سوچ سمجھ کر مجھے اپنائے تو یہ دانشمندی ہو گی۔ بعد میں وہ یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اس نے نادانستگی میں اس کے بھائی سے دھوکا کھایا ہے۔

'ہاں یہی سیدھا سچا اور ایمان کا راستہ ہے کہ شہر یار پہلے خود کو پہچانے مگر کس طرح پہچانے۔'

وہ بستر کے سر پر آ کر بیٹھ گئی۔ پھر لیٹ گئی۔ پھر کروٹ پر کروٹ بدلنے لگی۔

ہر کروٹ پر دل یہی کہتا تھا کہ وہ اپنی زلفوں میں پھول لگا کر اس کے سامنے جائے۔ خواب میں جو چہرہ دھندلا جاتا ہے وہ واضح ہو جائے گا۔ شہر یار اسے بھی پہچان لے گا اور خود بھی پہچان لے گا۔

مگر وہ پھول نہیں لگانا چاہتی تھی۔ اگر وہ ہاتھ بڑھا کر پھول مانگ لے تو وہ کیا کرے گی۔

نہیں شادی سے پہلے وہ غیر ہے اور وہ غیر مرد کو اپنا پھول پیش نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا اٹل فیصلہ تھا کہ وہ شہر یار کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن ایک عورت کے غرور کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔



رات کی تاریکی پھیلتے ہی نثار کار میں بیٹھ کر ایمان علی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ شہر یار کی کار تھی جسے اب وہ استعمال کر رہا تھا اور اس کے ہوٹل کی آمدنی پر بھی ہاتھ صاف کر رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ اس کی والدہ کی نظروں میں بھی ایک بیٹے کا مقام حاصل کرے۔ اتنا اہم مقام حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ بیٹا ہمیشہ کے لیے ماں کی نظروں سے دور ہو جائے یا مر جائے۔

ہاں وہ مر جاتا۔ اگر ایمان علی راستے کی دیوار نہ بن جاتا۔ جب تک وہ ایمان علی کے سائے میں تھا۔ نثار مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔ ہمیشہ اس بات کا خدشہ رہتا کہ وہ کس دن اپنی والدہ کے پاس پہنچ جائے گا۔

نثار راستے میں ایک پارک کے سامنے رک گیا۔ کار سے اتر کر اندر گیا۔ اس نے سوچا کہ آج ایمان علی سے فیصلہ کرے گا اس کی منہ مانگی رقم اسے دے کر شہر یار کو اپنے قبضے میں کر لے گا اور اسے اس شہر سے دور کہیں لے جا کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

وہ اہم منصوبے بنا رہا تھا۔ منصوبے کی تکمیل کے بعد اس نے کار اسٹارٹ کی اور ایمان علی کی طرف چل

پڑا۔

ایمان علی کی ٹیکسی میں کچھ خرابی ہوگئی تھی۔ وہ بونٹ اٹھائے خرابی کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا شہر یار اس کے قریب کھڑا ہوا خاموشی سے ٹیکسی کے انجن کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت نثار کی کار ان کے قریب آ کر رک گئی۔

نثار نشہ میں تھا۔ اس نے دور سے شہر یار کو نہیں پہچانا قریب آ کر رکتے ہی شہر یار سے اس کی نظریں ملیں تو وہ بوکھلا گیا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ مگر شہر یار انجان بن کر اپنی کار کو دیکھ رہا تھا۔ ایمان علی نے کہا۔

''آیئے نثار صاحب! ان سے ملیے۔ یہ میرے دوست شہر یار ہیں۔'' وہ کار سے باہر آ گیا اور جھجکتے ہوئے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' شہر یار نے جواب دیا۔

''یہ تو ایک رسمی جملہ ہے کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی آپ کے چہرے پر خوشی کے بجائے پریشانی ظاہر ہو رہی ہے نثار جبرا" مسکراتے ہوئے بولا۔

''جی ہاں، کاروباری پریشانیاں پیچھا نہیں چھوڑتیں مگر آپ سے مل کر واقعی خوشی ہو رہی ہے۔''

شہر یار نے کہا۔

''چلیے آپ کہتے ہیں تو یقین کر لیتا ہوں۔ کیا یہ آپ کی کار ہے۔''

شہر یار کی کار تھی اور شہر یار پوچھ رہا تھا۔ اس لیے وہ پھر بوکھلا گیا۔

''جی، جی ہاں میری کار ہے۔''

شہر یار آگے بڑھ کر کار کی باڈی پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اس کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں اور اس میں بیٹھ چکا ہوں۔''

اس بار نثار اور ایمان علی دونوں ہی پریشان ہوگئے کہ کہیں وہ اپنی کار کو پہچان نہ لے۔ لیکن شہر یار نے پلٹ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''میں بھی کیسی باتیں سوچتا ہوں۔ ایمان علی تم تو کہتے ہو کہ میں تمہاری طرح ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا پھر اتنی مہنگی کار سے مجھ غریب کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ میں پچھلی باتیں یاد کرتے کرتے بہت سی فضول باتیں سوچنے لگتا

ہوں۔نہیں اس کار کے متعلق سوچنا ایسی ہی بات ہے جیسے جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنا۔''

ایمان علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔دونوں کے مقدر میں ٹیکسی ہے اتنی مہنگی کار نہیں ہے۔''

شہر یار نے سر ہلا کر کہا۔

''نثار صاحب! یہ سچ ہے کہ آپ جیسی ہماری تقدیر نہیں ہے۔لیکن تھوڑی دیر کے لیے اس میں بیٹھ سکتا ہوں۔اگر آپ اجازت دیں۔''

نثار نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میری طرف سے اجازت ہے۔آپ کار میں بیٹھیں گے تو میرا کیا بگڑ جائے گا۔آپ ضرور بیٹھیں۔''

ایمان علی نے بھی تائید کی۔

''ٹھیک ہے نثار صاحب! شہر یار کو یہاں بیٹھنے دیجیے ہم کمرے میں چل کر باتیں کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' باتیں اہم تھیں۔نثار فیصلہ کرنے آیا تھا کہ شہر یار کو اپنے ساتھ لے جائے گا اور شہر یار سے اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ وہ کار میں بیٹھ کر ماضی کو یاد کر لے گا کیونکہ ایمان علی نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور ہے۔

وہ دونوں مطمئن ہو کر مکان کے اندر چلے گئے۔

شہر یار دوبارہ اس کار کی چکنی باڈی پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میرا ہے اور وہ کم بخت مالک بن کر عیش کر رہا ہے۔میں ایمان علی کو تگنی کا ناچ نچا رہا ہوں۔وہ شبو کو مجھ سے منسوب کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بازی کا رخ اس کی بہن کی طرف موڑ دیا ہے۔

صرف اسے نہیں، نثار کو بھی ایک اچھا سبق سکھانا ہوگا وہ بھی کا یاد کرے گا۔کسی دماغی مریض سے پالا پڑا تھا۔

وہ سوچتے ہوئے کار میں آ کر بیٹھ گیا۔اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔نثار نشے کی مستی میں تھا۔چابی وہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔شہر یار نے گہری نظروں سے کار کا جائزہ لیا۔پچھلی سیٹ میں اس کا کوٹ پڑا ہوا نظر آیا۔وہ

کوٹ اٹھا کر جیبوں کی تلاشی لینے لگا

اندرونی جیب میں ایک بنک کا پاس بک رکھا ہوا تھا۔ وہ پاس بک نثار کی بیوی رقیہ کے نام تھا اس نے اسے کھول کر دیکھا۔ روزانہ مختلف رقمیں جمع ہوتی رہی تھیں۔ آخری تاریخ میں کل رقم پندرہ لاکھ چھ سو روپے لکھی ہوئی تھی۔ اتنے روپے رقیہ نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ نثار ہوٹل کی آمدنی میں بے ایمانی کر رہا ہے۔

شہریار نے بنک کے نام اور رقیہ کا اکاؤنٹ نمبر یاد کیا اور پاس بک کوٹ کی اندرونی جیب میں واپس رکھ دی۔

اسی وقت ریشم نجو کے مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہی تھی۔ شہریار کو کار میں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

وہی کار تھی۔ وہی شہریار تھا اور وہ کار کے سامنے اس طرح رک گئی تھی کہ کالج کے گیٹ کے سامنے والا منظر نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

شہریار نے فورا" ہی کار سے باہر آتے ہوئے کہا۔

''اس کار کی ونڈ اسکرین سے ابھی تمہیں دیکھ کر یوں لگا جیسے یہی منظر میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ کیا تمہیں ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے۔''

ریشم فیصلہ کر چکی تھی کہ کس طرح اس کی یادداشت واپس لائے گی۔ وہ جلدی سے قریب آ کر بولی

''پہلے یہ بتایئے بھائی جان کہاں ہیں۔''

''وہ مکان کے اندر ہیں اور کسی نثار صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔''

''اوہ!'' وہ مضطرب ہو کر بولی۔ ''آپ کسی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ خدا کے لیے خود کو بچایئے ورنہ آپ بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔''

''میں بہت کوشش کرتا ہوں ، مگر مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ اسی لیے میں تم سے پوچھتا ہوں۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ تم مجھے ٹال دیتی ہو۔''

''میں مجبور ہوں میں آپ کو کیسے سمجھاؤں ۔ایک طرف بھائی کی عزت ہے دوسری طرف آپ ،آپ سے ہمدردی ہے اچھا ایک بات بتائیے ۔اگر میں آپ سے کچھ کہوں گی تو آپ اسے ایک راز بنا کر دل میں چھپائیں گے۔کسی سے نہیں کہیں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں ۔تم میری بھلائی کے لیے اگر کچھ کہو گی تو وہ بات میری زبان سے باہر نہیں جائے گی اور میں تمہیں اپنی محسنہ سمجھ کر ہمیشہ تمہاری عزت کرتا رہوں گا۔''

ریشم نے کہا

''ایک بات کا اور وعدہ کریں کہ چاہے کچھ ہو۔آپ میرے بھائی جان سے نفرت نہیں کریں گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں اور اس خلوص کی قسم کھاتا ہوں ،جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔''

''میرے بھائی جان دل کے بہت اچھے ہیں۔ دوسروں کے کام آنے کے لیے کبھی کبھی بے ایمانی بھی کرتے ہیں یہ بات کہتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں اپنے ہی بھائی کی توہین کر رہی ہوں۔مگر کیا کروں۔ چپ رہتی ہوں تو آپ کی زندگی برباد ہو جاتی ہے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔میں خدا کے قہر سے ڈرتی ہوں اور اسی قہر سے بھائی جان کو بچانا چاہتی ہوں۔مگر وہ نہیں مانتے ۔ایسی بے ایمانی کر رہے ہیں کہ آپ کو آپ کی والدہ سے دور رکھ رہے ہیں اور آپ کو نثار کی سازش سے بھی بچا رہے ہیں۔''

شہر یار نے جان بوجھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''کیا میری والدہ ہیں۔کہاں ہیں۔کیا تم جانتی ہو۔''

''میں نہیں جانتی ۔ بھائی جان جانتے ہیں اور وہ نثار آپ کا کوئی عزیز ہے۔میں صرف ایک فون نمبر جانتی ہوں۔آٹھ دو صفر ایک ایک اس نمبر کے ذریعے آپ اپنی والدہ تک پہنچ سکتے ہیں۔وہ بدمعاش نثار آپ کو ہمیشہ کے لیے آپ کی والدہ سے دور کر دینا چاہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ بیٹا نہیں رہے گا۔تو ماں کچھ دنوں تک ماتم کرے گی۔پھر سارا کاروبار اس کے حوال کر دے گی۔کیا آپ میری ان باتوں کا یقین کریں گے۔''

''ہاں یقین کر رہا ہوں۔تمہاری سچائی اسی سے ظاہر ہے کہ تم ایک محبت کرنے والے بھائی کی غلطیوں کو بھی مجھ سے نہیں چھپا رہی ہو۔ میں تمہارے بھائی سے نفرت نہیں کروں گا۔ کیونکہ وہ بے ایمانی کے باوجود نثار کی

سازشوں سے مجھے بچا رہا ہے۔ اور اس نے اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ بہر حال جو کچھ تم نے کہا ہے میں اس کا ذکر کبھی تمہارے بھائی کے سامنے بھی نہیں کروں گا۔

میں کبھی تمہیں کسی کی نظروں سے نہیں گراؤں گا۔ تم بہت اچھی ہو ریشم! تمہارے دل میں ایمان ہے۔ میں ہمیشہ تمہاری قدر کروں گا۔ تم میرے متعلق اور جو کچھ جانتی ہو بتاؤ۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''

وہ بہت کچھ جانتی تھی۔ پھول اور زلفوں کی کہانی جانتی تھی مگر جان بوجھ کر شہریار کی زندگی کے خوب صورت پہلو سے اپنا پہلو بچا رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

''نہیں سب اور کچھ نہیں جانتی جو میرے علم میں تھا وہ میں نے بتا دیا۔'' شہریار نے ایک سرد آہ بھر کر کہا

''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم کیا جانو کہ وہ لڑکی کون ہے جو اپنے بالوں میں پھول لگا کر میرے خوابوں اور خیالوں میں آتی ہے مگر اپنی صورت نہیں دکھاتی ، میری سمجھ میں نہیں آتا ریشم کہ وہ مجھ سے چھپتی کیوں ہے؟۔''

وہ انجان بن کر اس سے پوچھ رہا تھا وہ چھپتی کیوں ہے۔ بھلا وہ کیا جواب دیتی۔ اس پر تو گھبراہٹ سی طاری ہوگئی تھی وہ جلدی سے دوسری طرف منہ پھیر کر بولی

''مم میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''ہاں تم بھی نہیں جانتیں۔ میں بھی نہیں جانتا ۔لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہی لڑکی میری یادداشت واپس لا سکتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ میرے خاندان کی لڑکی ہو۔ مس ابھی جا کر اس فون نمبر کے ذریعہ اپنی امی سے ملوں گا اور اپنے خاندان کے افراد کو دیکھوں گا۔ شاید ان میں وہ لڑکی نظر آجائے۔'' وہ پلٹ کر اسٹیرنگ سیٹ کی طرف جانے لگا۔

ریشم کے دماغ میں اس کی باتیں گونج رہی تھیں کہ وہی اس کی یادداشت واپس لا سکتی ہے اور وہ دیوانہ اس کی تلاش میں اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا

''سنیے!'' وہ دوڑتی ہوئی قریب آئی۔ ''آپ اس طرح کہاں جا رہے ہیں۔ یہاں کے راستے آپ کو یاد نہیں ہوں گے۔ آپ بھٹک جائیں گے۔''

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ریشم ہوسکتا ہے کہ میں بھٹکتا ہوا اس لڑکی تک پہنچ جاؤں۔ ویسے یہ بتاؤ

تمہیں فون نمبر کیسے معلوم ہوا۔''

''میں ایک شادی کی تقریب میں گئی تھی۔ وہاں ایک شخص آپ کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے آپ کے گھر کا فون نمبر پوچھ لیا مگر شہریار صاحب آپ اس طرح جائیں گے تو بھائی جان کو شبہ ہوگا کہ شاید میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''تم اطمینان رکھو۔ انہیں شبہ نہیں ہوگا۔ میں صبح تک واپس آ جاؤں گا۔ تم فورا" ہی نجو کے مکان میں چلی جاؤ تاکہ وہ باہر آ کر تمہیں نہ دیکھیں۔''

اس نے الجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا

''کیا آپ وعدہ کرتے ہیں کہ صبح تک واپس آ جائیں گے۔''

''ہاں وعدہ کرتا ہوں مجھ پر بھروسا کرو اور جلدی ہی یہاں سے جاؤ۔ اگر ان کی باتیں ختم ہو گئیں تو وہ باہر آ جائیں گے۔''

ریشم جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی نجو کے مکان میں چلی گئی۔ شہریار نے اگنیشن کی چابی گھمائی۔ کار اسٹارٹ کی اس کی آواز مکان کے اندر تک گئی۔ نثار نے چونک کر کہا۔

''یہ میری کار کی آواز ہے۔ کہیں وہ اسٹارٹ نہ کر رہا ہو اوہ مجھ سے بھول ہوئی میں چابی وہیں چھوڑ آیا ہوں۔''

وہ اور ایمان علی جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آئے مگر دیر ہو چکی تھی۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی دور چلی جا رہی تھی۔

''ارے غضب ہو گیا!'' ایمان علی نے بوکھلا کر کہا۔

نثار اس سے زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ جس دولت پر وہ سانپ بن کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس کا حقدار ادھر جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''ارے وہ کہاں جا رہا ہے اسے روکو......''

اسے روکنے کے لیے ایمان علی اپنی ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ نثار بھی آ کر بیٹھ گیا۔ ایمان علی نے اسے

دو چار بار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی پھر اسے یاد آیا کہ ٹیکسی تو شام ہی سے چلنے سے انکار کر رہی ہے وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتا ہوا باہر آ گیا۔

''نثار صاحب ہماری تقدیر ہی نہیں۔ٹیکسی بھی خراب ہے۔آ یئے آگے جا کر دیکھیں۔شاید وہ رک گیا ہو۔یا پھر ہمیں کوئی ٹیکسی مل جائے۔''

وہ دونوں دیوانہ وار ادھر بھاگتے چلے گئے۔جدھر شہر یار گیا تھا۔

ریشم کھڑکی سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ کس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔شہر یار کے پیچھے۔

نہیں انسان کی کیا قیمت رہ گئی ہے کہ وہ شہر یار کے پیچھے بھاگیں وہ دونوں لالچ کی سڑک پر بے ایمان ضرورتوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

شہر یار نے ایک ٹیلی فون بوتھ کے پاس جا کر کار روکی کار سے باہر نکل کر بوتھ کے اندر چلا گیا۔پھر کوائن ہول میں سکے ڈالنے کے بعد ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

وہ اپنے ہوٹل کے منیجر کو کال کر رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔شہر یار نے کہا

''منیجر بشیر احمد کو ریسیور دو'' وہ انتظار کرنے لگا۔پھر منیجر کی آواز آئی۔

''ہیلو کون صاحب ہیں''۔

شہر یار نے جواب دیا

''میں اپنا نام بتا رہا ہوں۔مگر وہ نام تم زبان پر نہ لانا۔کیا تم مجھے آواز سے نہیں پہچان سکتے۔''

''پپ ، پہچان رہا ہوں۔مگر یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ شہر یار صاحب ہیں۔''

''میں نے ابھی تم سے کہا ہے کہ میرا نام زبان پر نہ لانا۔کیا تم گھاس کھاتے ہو۔''

''بھول ہوگئی جناب۔''

''دیکھو میں نہیں چاہتا کہ ہوٹل میں میرے متعلق کسی کو کسی بات کا علم ہو۔تم ابھی امی کو بھی فون نہ کرنا پہلے مجھ سے آ کر ملو۔''

''جی اچھا کہاں آ جاؤں۔''

''ہوٹل سے باہر نکلو۔دائیں طرف سوگز کے فاصل پر جو پارک ہے وہاں آ کر میرا انتظار کرو۔''

''جی اچھا ابھی آ تا ہوں۔''

''اور سنو کچھ سادے کاغذات اور ایک قلم لے آنا۔''

''لے آؤں گا اور کچھ۔۔''

''بس چل آؤ۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔بوتھ سے باہر آ کر اس نے دائیں بائیں دور تک نظریں دوڑائیں۔وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نثار اور ایمان علی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔وہ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔پھر اسے اسٹارٹ کر کیے پارک کی طرف جانے لگا۔

راستے میں وہ اپنے منصوبوں پر غور کرتا رہا کہ کس طرح کامیابی سے نثار کو تگنی کا ناچ نچایا جائے۔پارک کے پاس پہنچ کر اس نے ایک درخت کے سائے میں کار کھڑی کر دی تا کہ سڑک سے گزرنے والوں کو اندھیرے میں وہ کار نظر نہ آئے پھر وہ پارک میں چلا گیا۔

منیجر بشیر پتھر کی ایک بنچ کے پاس کھڑا ہوا چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا شہر یار کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اچانک ہی اس کے قدموں پر گر کر گڑگڑانے لگا۔

''شہر یار صاحب ،خدا کے لیے مجھے جھوٹے الزامات سے بچایئے نثار مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔اس کی وجہ سے میں بے ایمان بنتا جا رہا ہوں۔''

شہر یار نے اس کے بازوؤں کو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں ۔تم بے ایمان نہیں ہو لیکن یہ بتاؤ کہ وہ کس طرح تمہیں بے ایمان بنا رہا ہے۔آؤ ہم کار میں چل کر بیٹھیں گے۔''

وہ پارک سے باہر جانے لگے۔منیجر اپنی بپتا سنانے لگا

''وہ ایک روز میرے کمرے میں اخبار کا ایک صفحہ لے کر آیا۔اس میں آپ کی تصویر شائع ہوئی تھی اور یہ لکھا تھا کہ نامعلوم دشمنوں نے آپ کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔لیکن آپ بچ گئے۔یہ بھی لکھا تھا

کہ آپ اپنی پچھلی زندگی بھول چکے ہیں مگر ، مگر آپ تو مجھے پہچان رہے ہیں۔''

''ہاں میں سب کے چہرے پہچان چکا ہوں۔تم اپنی سناؤ۔''

منیجر نے کہا۔''نثار مجھ پر الزام لگانے لگا۔ میں آپ کو ایئرپورٹ تک چھوڑنے گیا تھا لیکن راستے میں ، میں نے آپ کو مار ڈالنے کی کوشش کی اور آپ کا سامان اپنے اسٹور روم میں لاکر چھپا دیا۔آپ نے اپنا جو سامان رکھنے کے لیے مجھے دیا تھا وہ میرے ناکردہ جرم کا کھلا ثبوت بن گیا ہے۔اگر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ نے میری زبان بند کی تھی اور جرمنی کے جانے کے بہانے اس شہر میں گھوم رہے تھے تو آپ کی امی اور پولیس والے یقین نہں کریں گے اور میں نے سوچا کہ آپ خود کو بھول چکے ہیں۔میری سچائی کا انہیں یقین نہں دلاسکیں گے۔

نثار نے مجھ سے ہمدردی ظاہر کی۔اس نے کہا کہ وہ آپ کو اسپتال سے لے جا کر اپنی بیوی کے سسرال میں رکھے گا اور آپ کی یادداشت واپس لانے کی کوشش کرے گا۔اس کے بعد ہی آپ میری سچائی کا ثبوت دینے آئیں گے۔اس نے اسٹور روم کی چابیاں اپنے پاس رکھ لی ہیں۔یعنی میرے ناکردہ جرم کا ثبوت اسٹور روم میں بند کر رکھا ہے اور روزانہ تین چار ہزار روپے آپ کے علاج اور دوسرے اخراجات کے لیے لے جاتا ہے

میں نادان نہیں ہوں ، سب سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔لیکن میں اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔وہ پولیس کو بلا کر اسٹور روم کا سامان دکھانے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔''

وہ کار میں آکر بیٹھ گئے۔شہریار نے کہا

''اب وہ زیادہ دنوں تک دھمکیاں نہیں دے گا۔کچھ روز اور تم اس کے اشاروں پر چلتے رہو۔میں اسے ایک اچھا سبق سکھانا چاہتا ہوں۔تم یہ بتاؤ کیا ہوٹل کے پتے پر نثار کا کوئی خط وغیرہ آتا ہے۔''

''جی ہاں اس کے دوستوں کے خطوط آتے ہیں۔''

''کیا ان دوستوں میں لڑکیاں بھی ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم جناب ! میں نے اس کا خط کھول کر کبھی نہیں پڑھا۔آج ہی ایک خط آیا ہے۔ میں اسے نثار کو دینا بھول گیا تھا۔وہ کاؤنٹر کے ایک دراز میں رکھا ہوا ہے۔''

شہریار نے اس کے ہاتھ سے کاغذ اور قلم لے کر کہا۔

''میں ایک خط لکھتا ہوں۔تم اسے ساتھ لے کر جاؤ۔ ہوٹل میں خط رکھا ہوا ہے۔اس کا لفافہ کھول کر ضائع کردو اور اس لفافہ میں اس خط کو رکھ دو۔اس کے بعد رقیہ کو فون کر کے ہوٹل میں بلانا۔ اگر تم اس کے دل میں نثار کے خلاف شبہ پیدا کر دو گے کہ وہ کسی دوسری لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے تو وہ تیر کی طرح ہوٹل میں آئے گی۔تم ثبوت کے طور پر یہ خط لفافہ سمیت اس کے حوالے کر دینا۔''

یہ کہہ کر کہ شہریار بائیں ہاتھ سے ایک خط لکھنے لگا

''میرے پیارے نثار

میرے جانثار

تمہارا خط پڑھ کر دل کو راحت ملی۔ نہ جانے ہم کب تک جدائی کی گھڑیاں گزاریں گے۔ میں ایک آدھ ہفتے کے لیے تمہارے شہر آتی ہوں تو تم بیوی سے چھپ چھپ کر مجھ سے ملتے ہو۔تم نے آخری بار قسم کھائی تھی کہ تم اسے جلد ہی طلاق دے دو گے۔ سچ کہتی ہوں نثار وہ تمہارے قابل نہیں ہے۔ کہاں تم پڑھ لکھے اسمارٹ نوجوان اور کہاں وہ تینوں بچوں کی ماں وہ تو دیکھنے میں اتنی بوڑھی ہے کہ تمہاری ماں لگتی ہے۔تم نے پچھلے خط میں لکھا ہے کہ ابھی کچھ مجبوری ہے وہ تمہارے کس راز سے واقف ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔اس چڑیل کو دشمن نہ بناؤ۔ اللہ نے چاہا تو اسے ملیریا ہو جائے گا۔ چیچک نکل آئے گی یا ڈبل نمونیے میں مبتلا ہو کے جلد ہی مر جائے گی اور زیادہ کیا لکھوں تم جو دو ماہ سے پانچ ہزار روپے کا ڈرافٹ بھیج رہے ہو تو اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں دولت کی بھوکی نہیں ہوں۔تمہاری بھیجی ہوئی رقموں کو تمہاری امانت سمجھ کر رکھ لیتی ہوں۔فقط تمہیں بہت سا پیار۔تم پر جان نثار کرنے والی......فہمیدہ''

منیجر نے وہ خط پڑھ کر کہا۔

''یہ خط ایک دھماکا ثابت ہو گا۔ دونوں میاں بیوی میں جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔لیکن آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ سیدھی طرح اپنی کوٹھی میں جایئے اور انہیں دھکے دے کر نکال دیجیئے۔'' شہریار نے جواب دیا

''ابھی مجھے اپنی کوٹھی سے صرف اتنی دلچسپی ہے کہ وہاں میری امی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ انہیں کس طرح تسلیاں دوں۔ وہ میرے لیے پریشان ہوں گی۔''

''ہاں وہ پریشان تو ہیں۔ آج کل ایک عامل صاحب آپ کو بلانے کے لیے کوئی عمل کر رہے ہیں۔''

''اچھا!'' اور یہ کہہ کر وہ دوسرے کاغذ پر دوسرا خط لکھنے لگا۔ اس بار وہ دائیں ہاتھ سے لکھ رہا تھا۔

''برخوردار نثار سلمہ

بعد دعائے عمر دراز کے معلوم ہو کہ میں فہمیدہ کی ماں جان ہوں۔ تم تو جانتے ہو بیٹا کہ میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتی۔ ڈاک خانے کے منشی جی سے دو حرف لکھوا رہی ہوں۔ تم تھوڑے لکھے کو بہت جانو اور دو چار روز کے لیے اپنی جورو سے کوئی بہانہ کر کے یہاں چلے آؤ۔ تم فہمیدہ کے لیے جو آم کے باغات خریدنے کی بات کر رہے تھے اس کا سودا ہو چکا ہے۔ تمہارے بھیجے ہوئے تیس ہزار روپے ہم نے پیشگی ادا کر دیے ہیں۔ باقی چالیس ہزار روپے دینے کے بعد وہ باغات فہمیدہ کے نام ہو جائیں گے تم ہر ماہ پابندی سے دس ہزار بھیجتے رہے تو چھ ماہ میں ساٹھ ہزار ہو جائیں گے۔ آج باغات سے موسم کے پہلے آم آئے ہیں۔ فہمیدہ نے ذرا نہیں چکھے' کہتی ہے تم آؤ گے تو تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔ میں نے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانتی۔ اسی لیے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ تم جلدی چلے آؤ۔ تم دونوں نئے باغات کے نئے پھل نہیں کھاؤ گے تو بدشگونی ہوگی۔ لہذا اس خط کو تار سمجھو اور فورا "چلے آؤ.................... تمہاری ہونے والی ساس''

شہریار لکھ رہا تھا اور منیجر پڑھ رہا تھا۔ خط مکمل ہونے کے بعد منیجر نے اپنے کانوں کو چھو کر کہا۔

''اللہ رحم کرے۔ آپ یہ خط لکھ کر نثار کے پاؤں تلے بارود بچھا رہے ہیں۔''

شہریار نے سر ہلا کر کہا۔

''بشیر تم جانتے ہو کہ امی جان کتنی رحم دل ہیں۔ جب انہیں نثار کی بے ایمانی اور فریب کا پتا چلے گا تو وہ اسے برا بھلا کہہ کر معاف کر دیں گی یا زیادہ سے زیادہ اس گھر سے نکل جانے کا حکم دیں گی۔ مگر نثار ایک ماں اور بیٹے کو ہمیشہ کے لیے جدا کر دینے کی جو سازشیں کر رہا ہے۔ اس کی سزا بھی ان سازشوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ میں اسے ذہنی الجھنوں میں مبتلا کر دوں گا۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچتا پھرے گا۔ اچھا وہ دیکھو

نثار کا کوٹ پچھلی سیٹ پر ہے اسے اٹھاؤ۔''

منیجر نے پچھلی سیٹ کی طرف جھک کر اسے اٹھایا۔شہر یار نے اس دوسرے خط کو تہہ کیا اور اسے نثار کے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ دیا۔ پھر وہ دوبارہ کوٹ کی جیبوں کو ٹٹولنے لگا۔ایک جیب میں چابیوں کا گچھا رکھا ہوا تھا۔اس نے وہ چابیاں منیجر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ،کیا اس میں تمہارے اسٹور کی چابی ہے۔''

منیجر نے ایک ہی نظر میں اپنے اسٹور روم کی چابی پہچان لی۔ ''جی ہاں یہ ہے وہ چابی۔''

''اسے نکال کر اپنے پاس رکھ لو۔ یہاں سے جاتے ہی اسٹور روم کھول کر میرا سامان دوسری جگہ چھپا دینا ۔بتاؤ تم اسے کہاں چھپا سکتے ہو۔''

منیجر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''میں اپنے بھائی کے ہاں رکھ دوں گا۔''

شہر یار نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ابھی چلو۔ وہ سامان نکال کر کار کی ڈگی میں رکھو۔ ہم ابھی اسے وہاں پہنچا دیں گے۔ پھر یہ چابی اسی طرح کوٹ کی جیب میں رکھ دیں گے۔''

وہ کار کو تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ ہوٹل سے کچھ دور اس نے کار روک دی۔ منیجر کار سے ہوٹل کی طرف چلا گیا۔آدھے گھنٹے کے بعد وہ سامان لے کر آیا شہر یار نے ڈگی کھول کر سامان رکھا اور پھر ڈگی بند کرنے کے بعد وہ دونوں کار میں آ بیٹھے۔ منیجر کے بھائی کا گھر دس منٹ کے راستے پر تھا۔ وہاں سامان رکھنے کے بعد منیجر کو واپس ہوٹل تک پہنچا دیا اور کہا

''نثار کو یہ نہ بتانا کہ تم نے اسٹور روم سے سامان غائب کر دیا ہے۔اس کی چابیاں پھر کوٹ کی جیب میں پہنچ گئی ہیں۔ وہ تم پر شبہ نہیں کرے گا۔ مگر ہاں کل سے تم اپنا رویہ بدل دو۔ اسے کیش میں سے ایک پیسہ نہ دو۔ ان دونوں میاں بیوی کو جتنے معقول انداز میں لڑا سکتے ہو لڑاتے رہو۔ یاد رکھو بڑے بڑے سازش کرنے والے صرف اپنے ذات جھگڑے سے ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔اچھا خدا حافظ۔''

یہ کہہ کر اس نے کار اسٹارٹ کی اور گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ اس چھوٹے راستوں سے گزر رہا تھا۔ جہاں سے اس کی لمبی چوڑی کار بمشکل راستہ بناتے ہوئے گزر رہی تھی۔ وہ نثار اور ایمان علی کی مناسبت سے اسے کھلی شاہراہوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔اس کے علاوہ شہریار نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جائے۔ لہذا وہ اپنی دانست میں اپنے شناساؤں سے کتراتا جا رہا تھا

لیکن محتاط رہنے کے باوجود پبلشر جبار صدیقی نے اسے دیکھ لیا۔شہریار ایک گلی سے دوسری گلی کی طرف کار موڑ رہا تھا۔ایک پان کی دکان کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ جبار صدیقی موڑ پر ہی کھڑا ہوا تھا اس نے شہریار کو دیکھتے ہی آواز دی۔

’’شہریار او بھائی شہریار رک جاؤ۔ میں ہوں جبار صدیقی۔‘‘

شہریار نے ایک جھٹکے سے کار روکتے ہوئے دل میں کہا۔

’’برے پھنسے۔اب میں اسے کیا سمجھاؤں گا۔‘‘

وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا اور خوشی سے کانپتا ہوا بولا۔

’’یہ سامنے والا مکان میرا ہے آؤ ایک پیالی چائے پیتے جاؤ۔‘‘

شہریار نے کار آگے بڑھا کر اس کے مکان کے سامنے روک دی پھر دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے بولا۔

’’ہم یہیں کھڑے ہو کر باتیں کر لیتے ہیں۔خوامخواہ آپ کے گھر والوں کو تکلیف ہوگی۔‘‘

’’نہیں بھئی ۔تکلیف کسی میں تو بالکل اکیلا رہتا ہوں۔دو سال پہلے بیوی مر گئی۔اس سے پہلے بچہ مر گیا۔ اس کے بعد پھر ایک شادی کی وہ بھی مر گئی معلوم ہوتا ہے کہ موت میری بیویوں کی سوکن ہے۔ جو بے چاری دلہن بن کر آتی ہے اسے کھا جاتی ہے۔‘‘

وہ شہریار کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے مکان کے اندر لے گیا۔اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد وہ چولہے پر چائے کا پانی رکھنے کے لیے کچن کی طرف چلا گیا۔شہریار سر پر ہاتھ رکھے سوچ رہا تھا کہ اب جبار

صدیقی کو بھی اپنے اعتماد میں لینا ہوگا۔ورنہ وہ کل صبح ہی اس کی والدہ کے پاس پہنچ جائے گا۔

جبار صدیقی نے واپس آ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ بھئی۔اتنے دنوں کہاں غائب رہے۔کیا تم واقعی اپنی یادداشت کھو چکے تھے۔''

شہر یار اسے شروع سے اب تک کے واقعات تفصیل سے سنانے لگا۔

جبار صدیقی بے حد متاثر ہو رہا تھا۔وہ سن رہا تھا کہ شہر یار نے زخم کھائے اور غریبوں کی زندگی کا تجربہ کرنے کی خاطر اپنی یادداشت کو کھو بیٹھا۔

وہ سن رہا تھا کہ نثار اسے لوٹ رہا ہے۔ایمان علی بھی لوٹ رہا ہے۔مگر اس کی حفاظت بھی کر رہا ہے۔یعنی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بے ایمانی کرتے ہیں اور ایمان سے بھی کام لیتے ہیں۔

وہ سن رہا تھا کہ ریشم کتنے ٹھوس کردار کی لڑکی ہے۔دل میں محبت رکھتی ہے اور لبوں تک اسے آنے نہیں دیتی۔شہر یار کو اس کی والدہ سے ملانے کے لیے اپنے بھائی کی سازش کو بے نقاب بھی کرتی ہے اور بھائی کی عزت برقرار رکھنے کی التجائیں بھی ،کرتی ہے۔

جبار صدیقی سر جھکا کر سنتا رہا اور سوچتا رہا۔جب شہر یار خاموش ہو گیا تو اس نے کہا۔

''تم نے واقعی زندگی کے بہت سے تلخ تجربات حاصل کیے ہیں۔تمہارا یہ ناول اگر شاہکار نہ ہوا تو یادگار ناول ضرور ہوگا۔میں تمہارے لکھے جانے والے ناول کے تمام کرداروں سے متاثر ہوں خاص کر شبو سے بے حد متاثر ہوں۔تم نے صحیح تجزیہ کیا۔ہمارے معاشرے میں ایسی عورتیں ہوتی ہیں جن کا ظاہر نفرت انگیز ہوتا ہے لیکن ان کے اندر جھانک کر دیکھو تو ایک ایسی سچی کھری عورت نظر آتی ہے جو اس کے گھناؤنے معاشرے کا ماتم کرتی رہتی ہے۔اچھا یہ بتاؤ کہ شبو کی عمر کیا ہے۔''

''یہی کوئی چوبیس یا پچیس برس کی ہوگی۔''

''ایک سال سے اپنی روح اور اپنی ضمیر کو کچلنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔''

''کیا اب تک ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جو اسے اس جہنم سے نجات دلا کر اپنی پناہ میں لے لیتا۔''

''نہیں ،کوئی نہیں ملا ملتے بھی ہیں تو ان کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔مثلا" ایمان علی بہت عرصہ سے اس

کی چھوٹی بہن کو چاہتا ہے ۔اس لیے بڑی بہن سے شادی نہیں کرسکتا ۔انہوں نے مجھ سے کہا میں تو شبو سے ملنے سے پہلے ہی ریشم کواپنانے کے خواب دیکھ رہا ہوں ۔انہیں مجبوریاں سمجھئے یا شبو کی بدنصیبی کہ لوگ آتے ہیں‘اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں پھر منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔

''بے چاری ا'' جبار صدیقی نے افسوس کا اظہار کیا۔''اوہ میں تو بھول ہی گیا۔ چولہے پر چائے کھول رہی ہوگی ۔''

وہ جلدی سے اٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا۔ پھر وہاں سے اس کے بڑبڑانے کی آواز آئی ۔

''یہ میں نے چینی کہاں رکھی ہے۔آں ،ہاں ،یاد آیا وہاں ہے بھئی یہ چولہے ہانڈی کا کام عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔''

شہریار کے دماغ میں اچانک یہ خیال آیا کہ اگر شبو کی شادی جبار صدیقی سے ہوجائے تو کتنا اچھا ہو۔شبو کی زندگی سنور جائے گی۔ جبار صدیقی کو گھریلو زندگی کا سکون ملے گا۔اس کی بھی تنہائی دور ہوجائے گی لیکن وہ اسے کیسے کہہ سکتا ہے کہ شبو سے شادی کرلے۔

اگرچہ وہ شبو سے ہمدردی ظاہر کررہا ہے لیکن ایسی عورتوں سے سب ہی ہمدردی کرتے ہیں اور جب ان سے شادی کرنے کا سوال آتا ہے تو ہر شخص اپنی اپنی مجبوریاں بیان کرکے کترا جاتا ہے۔

ایمان علی ٹھیک ہی کہتا تھا کہ شبو کو وہی قبول کرے گا جو اس کے متعلق کچھ نہ جانتا ہو۔اس دنیا میں ہمشہ ایمانداری سے کام نہیں نکلتا بعض اوقات جھوٹ اور بے ایمانی سے ایک مجبور اور مظلوم عورت سہاگن بن جاتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد جبار صدیقی چائے کی دو پیالیاں ہاتھوں میں اٹھائے آ گیا۔ایک پیالی شہریار کے سامنے رکھنے کے بعد صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اب کیا ارادہ ہے۔یہ یادداشت گم ہونے کا ڈرامہ کب تک کھیلو گے۔''

''دوچار دن اور اس کے بعد گھر چلا آؤں گا۔''

''پھر تمہاری ریشم کا کیا بنے گا؟۔''

''اسے اپنا بنانے کے لیے ہی اتنے پاپڑ بیل رہا ہوں جبار صاحب! ایک دن آپ نے کہا تھا کہ کوئی دولتمند کسی غریب لڑکی سے شادی نہیں کرتا۔ایسی شادیاں صرف فلموں اور ناولوں میں پیش کی جاتی ہیں۔نہیں حقیقت یہ ہے کہ حالات اور اتفاقات غریب کو امیر کے دروازے پر لے جاتے ہیں اور امیر کو کس غریب لڑکی کی زلفوں کے سائے میں پہنچا دیتے ہیں۔آپ خود ہی دیکھ لیں کہ میں ریشم کی غربت کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اس کی خاموشی محبت اور ٹھوس کردار سے متاثر ہو کر اسی اپنانا چاہتا ہوں۔ ایک دن میری طرح کوئی آدمی شبو کے دروازے پر بھی جائے گا اور اس کے اندر تڑپنے والی ایک شریف عورت کو دیکھے گا' سمجھے گا اور اسے قبول کر لے گا۔''

جبار صدیقی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ شبو دیکھنے سننے میں کیسی ہے؟۔''

"سننے میں سریلی ہے۔دیکھنے میں حسین ،ناک نقشہ اچھا ہے' رنگ گورا ہے۔شرماتی ہے تو گورے رنگ میں سرخی گھل جاتی ہے مگر آپ کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں؟۔''

''ہی ہی ہی ا'' وہ جھینپ کر ہنسنے لگا۔صوفے پر پہلو بدل کر شرمانے لگا۔

شہریار نے پوچھا۔

''یہ ہی ہی ہی کا مطلب کیا ہوا۔''

اس نے ذرا ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''شہریار میاں تم تو دیکھ ہی رہے ہو کہ یہ گھر ایک عورت کے بغیر کیسا ویران لگ رہا ہے۔دیکھو تم ہو ناول نگار اور میں ہوں ناشر۔تم صرف غریبوں کی زندگی پر ناول نہیں لکھ رہے ہو بلکہ ایک غریب لڑکی کو اپنی شریک حیات بنانے کا عزم کر رہے ہو۔میں بھی صرف وہ ناول شائع نہیں کروں گا بلکہ اس ناول کی ایک غریب لڑکی سے شادی کروں گا یعنی تم بھی غریب سے' میں بھی غریب سے ہم ایک جیسی لڑکی سے شادی کریں گے۔''

''ایک جیسی کا کیا مطلب ہوا۔یعنی میں بھی ریشم سے شادی کروں گا اور آپ بھی ریشم سے؟۔''

''ارے نہیں نہیں میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔لاحول ولاقوۃ' نہ جانے میں کیا کہہ گیا۔شادی چیز

ہی ایسی ہے کہ دفورِ شوق میں جانے زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے۔ کہتے وقت رسماً شرمانا بھی پڑتا ہے مگر شرمانے سے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اب تو کھل کر کہنا ہو گا۔ بھئی ریشم تمہیں مبارک ہو۔ میں تو ان صاحبہ کی بات کر رہا ہوں جو سننے میں سریلی اور دیکھنے میں حسین ہیں۔ یعنی وہی شب ،بو ،بو ہی ہی ہی۔''

شہر یار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے شرماتے شرماتے نام لے ہی لیا۔''

''اب کیا کیا جائے۔ تم ہونا سمجھ بچے اشاروں کو تو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔''

''آپ تو سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہے ہیں نا۔''

''بالکل ،میں نادان بچہ نہیں ہوں۔ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ کوئی عورت کی زندگی سنوارنے والا مل جائے تو وہ ایک اچھی اور وفادار بیوی ثابت ہوتی ہے۔

شہر یار میاں مجھ میں بھی ابھی انسانیت کی شرم باقی ہے اس لیے میں شبو سے شادی کروں گا۔''

شہر یار نے فرطِ عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''آپ بہت عظیم ہیں۔ آج پتا چلا کہ آپ محض گونگی کتابوں کے ناشر نہیں ہیں آپ اس دنیا کی بولتی کتابوں کو بھی پڑھتے ہیں، سمجھتے ہیں اور دل کے دھڑکتے ہوئے کاغذ پر انہیں چھاپ کر محفوظ کر لیتے ہیں۔ بس اب تمام باتیں آپ مجھ پر چھوڑ دیں شبو میری بہن ہے۔ میں دھوم دھام سے اس کی شادی کروں گا اور اس کی ضرورت کے مطابق جہیز دوں گا۔''

''نہیں جہیز ،کی اور روپے پیسے کی باتیں نہ کرو۔ میں کسی لالچ سے اسے نہیں اپناؤں گا۔''

شہر یار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ شبو کے معاملے میں نقدی اور جہیز نہیں لیں گے مگر مجھ سے روپے کا تقاضا کرتے رہتے ہیں۔''

''ہاں وہ روپے تم پر واجب الادا ہیں۔ کاروبار اپنی جگہ ہے۔ دوستی اور رشتے داری اپنی جگہ' کاروبار میں جو بات طے پا جاتی ہے۔ اس پر عمل کرنا عین شرافت ہے۔ دراصل رقم کا مطالبہ کرتے ہوئے میں تمہیں شرافت کا درس دیتا رہتا ہوں۔ ویسے تم شریف آدمی ہو۔ رقم تو مل ہی جائے گی' پہلے شبو کی باتیں کرو۔''

''کیا کروں۔ آپ اس کے متعلق پوچھیے میں جواب دیتا ہوں۔''

''بھئی پوچھنا کیا ہے۔ تم وہاں بیٹھے بیٹھے اپنی والی کو دیکھتے رہتے ہو۔ مجھے بھی شبو کی ایک جھلک دکھا دو۔''

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ابھی چلیے اور جی بھر کے اسے دیکھیے۔''

''اتنی رات ہوگئی ہے۔ اس بے چاری کو کیا تکلیف دو گے۔ کل صبح میں وہاں آ ؤں گا۔ تم مجھے پتا بتا دو۔''

''پتا نہیں بتاؤں گا۔ ابھی آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا شبو کو دیکھنے نہیں بلکہ مجھے وہاں تک پہنچانے کیونکہ ان دنوں میری یادداشت گم ہے۔ میں نثار سے اپنی کار لے کر ادھر ادھر بھٹک رہا ہوں اور وہ مجھے تلاش کر رہا ہے اب ہم دونوں کار میں بیٹھ کر جائیں گے اور اس کار کو کسی تھانے کے قریب چھوڑ دیں گے۔''

''ارے میاں یہ کیا حماقت کرو گے۔ پولیس والے چالان لے کر اس کار کے نمبر کے ذریعہ تمہاری کوٹھی تک پہنچ جائیں گے کیوں خوامخواہ جرمانہ ادا کرنا چاہتے ہو۔ جرمانے کی رقم حالانکہ نثار ادا کرے گا مگر وہ تمہارے ہی پیسے ہوں گے۔''

''کوئی بات نہیں جبار صاحب جرمانہ ہونے دیجیے۔ اس کار میں شراب کی بوتل ہے پولیس والے اور گھر والے دونوں ہی نثار کی خبر لیں گے پھر اس کے کوٹ کی جیب میں ایک خیالی محبوبہ کی اماں جان کا خط ہے رقیہ بیگم ان کے بارہ بجا دیں گی۔''

''ارے بھئی یہ سب کیا شیطانی حرکتیں کر رہے ہو۔''

''جناب ناشر صاحب ایسی حرکتیں نہ ہوں تو ناول میں دلچسپی پیدا نہیں ہوتی اور کہانی میں دھماکہ خیز موڑ نہیں آتے۔''

''ہاں کہتے تو ٹھیک ہو مگر میاں ناول کیا لکھ رہے ہو سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اسپتال والے اور پولیس والے تمہیں مظلوم مریض سمجھ کر تلاش کر رہے ہیں۔ تمہاری والدہ پیروں فقیروں اور عاملوں کے پاس دوڑی جا رہی ہیں۔ رقیہ بیگم کے لیے طلاق کا خدشہ پیدا کر دیا ہے۔ نثار اور ایمان علی سڑکوں پر بھاگتے پھر رہے ہیں اور ریشم سے ایسی محبت کر رہے ہو جو محبت کم اور دہشت زیادہ ہے۔ بے چاری نے مارے دہشت کے پھول

لگانا چھوڑ دیا ہے۔حتیٰ کہ مجھ جیسے پبلشر کو بھی نہیں چھوڑا۔ میرے سامنے شبو کی وہ تعریف کی ہے کہ میں بھی اس ناول کی چکی میں پسنے چلا آیا ہوں۔ خدا تم سے سمجھے۔ چلو اٹھو۔ تمہاری کار کا جنازہ تھانے تک پہنچا آؤں۔''

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر باہر آئے۔ جبار صدیقی نے مکان کے دروازے پر تالا لگایا۔ پھر شہر یار کے پاس اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی تو اس نے پوچھا۔

''اس گاڑی کو تھانے پہنچانے کے بعد کیا کرو گے؟''

''اس کے بعد ہم دونوں ایک گیت گائیں گے۔''

''گیت۔ ارے میاں کو میاں مذاق کرتے ہو۔''

''مذاق نہیں سچ کہتا ہوں۔ تھانے سے ایمان علی کا گھر دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اتنی دور پیدل جائیں گے تو گیت گاتے گاتے راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔''

''ہم وہاں ٹیکسی میں بھی جا سکتے ہیں۔ پیدل چلنا کیا ضروری ہے۔''

''ضروری اس لیے ہے کہ جتنی دیر میں ہم پیدل وہاں پہنچیں گے اتنی دیر میں پولیس والے اس گاڑی تک پہنچ کر اسے بخیریت میری امی جان یا رقیہ بیگم تک پہنچا دیں گے۔''

''اچھا سمجھ گیا۔ اب بتاؤ کہ ایمان علی کے گھر پہنچ کر کیا کیا جائے گا۔''

''آپ کا وہاں جا کر بیان دیں گے کہ میں نیو کیمپس کے پاس ٹھیک گیٹ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔''

''نیو کیمپس کہنا کیا ضروری ہے۔ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ تم کسی مسجد کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔''

''جبار صاحب ! میں مولوی نہیں ہوں۔ عاشق صادق ہوں میری اور ریشم کی پہلی ملاقات اس نیو کیمپس کے گیٹ کے سامنے ہوئی تھی۔ جب ریشم کو معلوم ہوگا کہ میں آج اس کی تلاش میں بھٹکتا ہوا کیمپس تک چلا گیا تھا تو وہ تڑپ جائے گی۔ مرغ بسمل کی طرح پھڑ پھڑائے گی۔''

''تم عاشق ہو یا قصائی۔''

''عاشق اور قصائی میں صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ عاشق کے ہاتھ میں چھرا نہیں ہوتا۔ وہ کمال محبت سے تڑپاتا ہے مگر ہم اپنے موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔ ہاں آپ وہاں جا کر یہ کہیں گے کہ آپ ٹیکسی میں چلے آ

رہے تھے۔ مجھے تنہا ویران راستے میں کھڑا دیکھ کر آپ نے ٹیکسی رکوائی۔ مجھ سے میرا نام پتا پوچھا۔ میں نے نام بتا دیا مگر پتا بھول گیا۔ آپ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر چوک بازار تک آئے اور میرے ساتھ پیدل گھومنے لگے کہ شاید مجھے راستہ یاد آ جائے۔ آخر ایک گھنٹہ کے بعد میں نے اس محلے کو پہچان لیا۔''

گاڑی تھانے سے ذرا دور رک گئی۔ شہریار نے اترتے ہوئے کہا۔

''چلیے اب پیدل چلتے ہوئے منصوبے بنائیں گے۔'' یہ کہہ کر دونوں پیدل چلنے لگے۔

☆☆☆☆

منیجر بشیر شہریار کو رخصت کرتے ہی ہوٹل میں آیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اس نے فون کر ریسور اٹھایا اور شہریار کی کوٹھی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ قائم ہو گیا۔ دوسری طرف سے کوئی ملازم بول رہا تھا۔ منیجر نے پوچھا۔

''رقیہ بی بی گھر میں ہیں۔ میں منیجر بشیر بول رہا ہوں۔ انہیں فون پر بھیجو۔ نثار صاحب کا ایک پیغام ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد رقیہ کی آواز سنائی دی۔ منیجر نے جواب دیا۔

''نثار صاحب مجھے کچھ بتا کر نہیں جاتے۔ پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ میں نے آپ کو ایک خاص بات کہنے کے لیے کال کیا ہے۔ یہاں نثار صاحب کے نام اکثر خطوط آتے ہیں۔ آج میں نے ایک غلطی کی ہے ان کا ایک خط کھول کر پڑھ لیا مگر میری اس غلطی سے آپ کی بھلائی ہو گی کیونکہ یہ خط ایک لڑکی کا ہے۔''

منیجر نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ رقیہ نے جلدی سے پوچھا۔

''کس لڑکی کا ہے۔ کیا لکھا ہے۔؟''

" کچھ نہ پوچھیے بی بی جی۔ یہ خط پڑھ کر پتا چلا کہ کس طرح آپ کی تباہی کا سامان کیا جا رہا ہے۔''

''وہ خط کہاں ہے؟۔''

"میرے پاس محفوظ ہے۔''

"ٹھہرو میں ابھی آ رہی ہوں۔''

دوسری طرف سے ریسیور رکھنے کی آواز آئی۔ منیجر نے بھی مسکراتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ وہ کاؤنٹر سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا میز کی دراز کھولنے کے بعد اس نے نثار کے نام آیا ہوا لفافہ نکال کر اسے کھولا۔ اس میں نثار کے کسی دوست کا خط تھا۔ منیجر نے اس خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے پھر ان ٹکڑوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک کر شہریار کے بائیں ہاتھ کا لکھا ہوا خط نکالا اور اس لفافے میں رکھ دیا۔ اس کے بعد ایک سگریٹ سلگا کر آرام سے کش لگانے اور دھواں چھوڑنے لگا۔

بیس منٹ کے بعد ہی رقیہ دندناتی ہوئی کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

''کہاں ہے وہ خط............؟۔''

"آپ اطمینان سے بیٹھیے۔ پہلے مجھے اس بات کا یقین دلائیے کہ اس خط کے سلسلے میں آپ میرا ذکر نثار صاحب سے نہیں کریں گی۔''

''نہیں کروں گی۔ لاؤ خط مجھے دو۔''

منیجر نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ رقیہ نے لفافہ لیا اور اس میں سے خط نکال کر پڑھنے لگی۔ پڑھنے کیا لگی ،انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اس خط میں اس کے خلاف ایسی ایسی باتیں لکھی ہوئی تھیں کہ جنہیں پڑھ کر کوئی برداشت نہ کرتی۔ رقیہ نے مارے غصہ کے اس خط کو یوں مٹھی میں بھینچ لیا جیسے خط لکھنے والی فہمیدہ کی گردن دبوچ رہی ہو، پھر وہ غصہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں نثار سے بھی سمجھ لوں گی۔ دولت ہاتھ آتے ہی مجھ سے نظریں پھیر لی ہیں۔ مجھے طلاق دینے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ہر ماہ روپے کا ڈرافٹ بھیجا جاتا ہے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ ہوٹل سے اتنی بڑی رقمیں لے جاتے ہیں۔

''مجھے کیا معلوم تھا بی بی جی میں تو یہ سمجھتا تھا کہ وہ یہاں سے کچھ لے جاتے ہیں۔ وہ سب آپ ہی کو دیتے رہتے ہیں۔ ویسے بی بی جی ! برا نہ مانیے گا۔ غلطی آپ کی بھی ہے۔ جو عورت اپنے خاوند کو پارسا سمجھتی ہے۔ وہ

ہمیشہ دھوکا کھاتی ہے۔''

''ہاں عورت دھوکا کھانے کے بعد کیسی ناگن بن جاتی ہے یہ تم نہیں جانتے مگر نثار کو اب پتا چلے گا۔'' منیجر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''کیا پتا چلے گا بی بی جی مرد اپنی بیویوں کو پھسلانے اور اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے ہزاروں ہتھکنڈے جانتے ہیں۔ایک بات یاد رکھیے۔اگر آپ ان باتوں سے بہل گئیں اور ان سے یہ کہہ دیا کہ یہ خط میں نے آپ کو دیا ہے تو آئندہ میں آپ کے کام نہیں آؤں گا۔دو ہفتہ پہلے ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔نثار صاحب نے اسے ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرایا تھا۔میرا خیال ہے کہ اسی کا نام فہمیدہ ہے اگر وہ دوبارہ یہاں آئے گی تو میں اسی شرط پر آپ کو اطلاع دوں گا کہ آپ نثار صاحب کے سامنے میرا نام نہیں لیں گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ ہم میاں بیوی کے جھگڑے میں تمہارا نام نہیں آئے گا۔وہ جب بھی یہاں آئی تم مجھے فورا" اطلاع دینا۔میں اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی۔اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔میں مروں گی تو نثار کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔میرے مرنے کے بعد بھی میرے بچوں کے لیے کوئی سوتیلی ماں نہیں آئے گی۔''

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی

منیجر نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے کش لگانے لگا۔آج اس کے دل و دماغ سے ناکردہ غلطیوں کا بوجھ اتر گیا تھا۔

☆☆☆☆

شہر یار اور جبار صدیقی پیدل چلتے چلتے منزل تک پہنچ ہی گئے۔ایمان علی مکان کے اندر بیٹھا ہوا تھا۔نثار پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا اور شہر یار کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

دوسرے کمرے سے ریشم نے ایمان علی کو آواز دے کر کہا۔

''بھائی جان آپ اپنے دوست کو سمجھائیے کہ وہ گالیاں نہ دیں۔ اپنی زبان قابو میں رکھیں یا اگر گالیاں ہی دینا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں کہ ذلیل کون ہے۔''

نثار چونک کر دوسرے کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ ریشم کی بات اس کے منہ پر تھپڑ کی طرح لگی تھی۔ ایمان علی نے کہا۔

''میری بہن ٹھیک کہتی ہے نثار صاحب! آپ کو سوچ سمجھ کر گفتگو کرنا چاہیے۔ وہ شہریار کی کار ہے۔ یاد داشت گم ہونے کے باوجود وہ ہمارے سامنے ہی کار میں یوں جا کر بیٹھ گیا تھا جیسے وہ اس کا پرانا گھر ہو۔ اسے یقیناً" اس کار سے اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی کہ وہ اسے ڈرائیو کرتا ہوا یہاں سے نکل گیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم اس کی واپسی کا انتظار کریں۔''

''مگر ہم کب تک انتظار کریں گے' رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ کیا میں صبح تک اس کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا۔''

''آپ شہریار کی عالیشان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کیا اس کے انتظار میں ایک رات انگاروں پر نہیں لوٹ سکتے۔''

"تم مجھے طعنے نہ دو۔ اسے آنے دو میں مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دوں گا۔''

''یقیناً آپ اس کا حلیہ بگاڑ سکتے تھے لیکن جب تک وہ میری نگرانی میں ہے' آپ کی یہ حسرت پوری نہیں ہوگی۔''

''آخر تم اس کی نگرانی کیوں کر رہے ہو۔ میں تمہیں بڑی سے بڑی رقم دے رہا ہوں مگر تم اسے میرے حوالے نہیں کرتے۔ آخر تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟۔''

''میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں بے ایمان ہوں مگر آپ کی طرح اس حد تک بے ایمان اور سنگ دل نہیں ہوں کہ اس کی جان کا دشمن بن جاؤں۔''

نثار نے چیلنج کیا۔ ''ایمان علی تم کب تک اس کی حفاظت کر سکتے ہو۔ اس خوش فہمی میں نہ رہو کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ میں جب چاہوں گا اسے چٹکی میں مسل دوں گا پھر اس کی موت کا الزام تم پر ہوگا۔ کیونکہ

تم نے اسے چھپا رکھا ہے اس بات کو یاد رکھو کہ ہم دونوں مجرم ہیں اگر ایک قانون کے شکنجے میں آئے گا تو دوسرا بھی کہیں بچ کر نہ جا سکے گا۔ اسی لیے میں اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے کہتا ہوں تم مجھ سے پورے دس لاکھ روپے لو اور اسے میرے حوالے کر دو۔ میں اس کا قصہ ہی تمام کر دوں گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ نثار اور ایمان علی دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر آئے اور اسے کھول دیا۔ باہر شہریار اور جبار صدیقی نظر آ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی نثار چیخنے لگا۔

''کہاں گئے تھے تم۔ میری کار کہاں ہے۔'' شہریار اس کا جواب دیے بغیر کمرے میں آ گیا۔ جبار صدیقی نے پوچھا۔

''آپ لوگوں میں سے ایمان علی کون صاحب ہیں؟۔''

''میں ہوں۔'' ایمان علی نے کہا۔

جبار صدیقی کہنے لگا۔

''یہ شہریار میاں آپ کے کون ہیں۔ ویسے جو کوئی بھی ہوں۔ آپ انہیں تنہا کیوں چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بے چارے راستہ بھول گئے تھے میں دو گھنٹے سے ان کے ساتھ پیدل گھوم رہا ہوں کہ یہ کسی طرح اپنے گھر کا راستہ پہچان لیں۔''

اس دوران نثار باہر گیا پھر وہاں سے واپس آ کر بولا۔

''میری کار کہاں ہے۔''

''کار......'' جبار صدیقی نے کہا۔ ''ان کے ساتھ کوئی کار نہیں تھی یہ بے کار تھے۔''

نثار نے چیخ کر کہا۔

''یہ کار لے گیا تھا۔ یہ کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ تم جھوٹ کہہ رہے ہو؟۔''

جبار صدیقی نے اس کے انداز میں انگلی اٹھا کر نثار سے کہا۔

''اے مسٹر آپ مجھ سے تم کہہ کر گفتگو نہ کریں۔ میں آپ جیسے بدتمیز لوگوں سے باتیں کرنا پسند نہیں کرتا۔'' ایمان علی نے نثار سے کہا۔

''آپ غصہ میں آداب اور طور طریقے بھول جاتے ہیں۔ اتنا تو آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ جب شہر یار آ گئے ہیں تو کار بھی مل جائے گی۔''

پھر اس نے جبار صدیقی سے کہا۔

''میں ان کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے شہر یار کو یہاں تک پہنچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے اب آپ یہ بتائیں کہ یہ آپ کو کہاں ملے تھے۔ یہ جہاں سے ملے ہیں۔ وہیں آس پاس کہیں کار بھی مل جائے گی۔''

''آپ آس پاس کہتے ہیں۔ مجھے دور دور تک کوئی کار نظر نہیں آئی۔ وہ راستہ دور تک ویران اور سنسان تھا۔ وہاں نہ آدم نہ کوئی آدم زاد تھا۔ میں انہیں نیو کیمپس سے اٹھا کر لا رہا ہوں۔''

''نیو کیمپس............؟''

دوسرے کمرے میں ریشم کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کے لیے اتنا سننا ہی کافی تھا کہ شہر یار اس وقت نیو کیمپس سے آ رہا ہے۔

وہ وہاں کیسے پہنچا۔

دیوانگی لے گئی۔ ہائے ریشم! دیکھو وہ کیسا دیوانہ ہے۔ وہ یہاں کا راستہ بھول گیا۔ وہ اپنی کوٹھی کا راستہ بھول گیا۔ لیکن کیمپس کا راستہ نہ بھول سکا۔ اتنی رات کو تیرے پیار کی کشش اسی جگہ اس دیوانے کو لے گئی جہاں اس نے پہلے تجھ سے ایک پھول مانگا تھا۔ صرف ایک پھول' دیکھ......وہ تیرے ایک پھول کے لے کیسے بھٹک رہا ہے۔

ریشم دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر یوں بیٹھ گئی جیسے اپنا دل نکال کر اس دیوانے کو پیش کرنا چاہتی ہو۔ ہائے میں تو دل دے چکی ہوں۔ ایک پھول کیا چیز ہے۔ نہیں نہیں۔ اب میں انہیں بھٹکنے نہیں دوں گی۔ بہت ہو چکا مجھ سے ان کی دیوانگی دیکھی نہیں جاتی۔

اس کے دل کی دھڑکنیں شور مچا رہی تھیں اور وہ اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں شہر یار آہستہ کہہ رہا تھا۔

''میں نہیں جانتا کہ اس جگہ کا نام کیا ہے۔ اگر وہ نیو کیمپس ہے تو میں پھر وہاں جاؤں گا۔ وہ کالج کا خاموش پھاٹک مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہاں میری قیمتی یادیں اور زندگی کا سرمایہ چھپا ہوا ہے۔''

اس نے انجان بن کر پوچھا۔

''شہریار تم نیو کیمپس کیسے پہنچ گئے۔ تم نے کار کہاں چھوڑ دی ہے۔''

شہریار نے جواب دیا۔

''میں نے یاد کرنے کی بہت کوشش کی ہے کہ وہ کار میں کس جگہ چھوڑ آیا ہوں۔ مگر وہ جگہ یاد نہیں آ رہی ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں کار ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پہلے بھی وہ کار ڈرائیو کرتا رہا ہوں۔ وہ کار مجھے آپ ہی آپ گلبرگ کے راستے لے جا رہی تھی۔''

نثار نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ گلبرگ کے راستے پر جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ بے خیالی میں اپنی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ شہریار کا بیان جاری تھا۔

''پھر ایسا ہوا کہ میں نے اچانک ہی کار روک دی مجھے سڑک سے دور وہی لڑکی نظر آ گئی۔''

''کون لڑکی؟'' ایمان علی نے پوچھا۔

دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی ریشم بھی توجہ سے سننے لگی۔ شہریار نے جواب دیا۔

''وہی جو میری جاگتی آنکھوں میں خواب بن کر آتی ہے۔ وہ ذرا دور ایک گلی میں مڑ گئی تھی۔ میں نے اس کے بالوں میں وہی پھول دیکھا تھا۔ میں فوراً ہی کار سے اتر گیا اور اس کے پیچھے جانے لگا۔ وہ ایک گلی سے دوسری گلی مڑ گئی۔ میں بھی اس پھول کو دیکھتا ہوا اس کا پیچھا کرتا رہا خوابوں میں بھی وہ پھول آگے آگے جاتا ہے اور میں پیچھے پیچھے چلتا ہوں۔ اس وقت بھی اس لڑکی کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج اس لڑکی کا چہرہ ضرور دیکھوں گا۔ وہ ایک مین روڈ پر آ کر بس میں سوار ہو گئی۔ میں بھی دوڑتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔''

نثار نے غصہ سے کہا۔

''تم تین لاکھ پچیس ہزار کی کار چھوڑ کر بس میں سوار ہو گئے۔ تمہارے جیسا احمق کوئی نہ ہو گا۔''

''ہاں میں احمق ہوں اور تم بھی احمق ہو' تم ایک قیمتی کار کے پیچھے بھاگتے ہو۔ میں پیار کے ایک پھول کے پیچھے بھٹکتا ہوں۔ اس دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی کا لج یا ضرورت یا اپنے جذبات کے پیچھے تمام عمر بھاگتا رہتا ہے۔ اسی لیے میں بھی بس میں سوار ہو گیا۔ وہ بس کے اگلے حصے میں عورتوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی میں نے اس بھیڑ میں اسے پھول سے پہچانا۔ چہرہ اس وقت بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس نامعلوم منزل کی طرف بھاگ رہی تھی۔ میں بھیڑ میں دھکے کھا کر کبھی ادھر ہو رہا تھا کبھی ادھر۔ کبھی وہ نظر آتی تھی۔ کبھی مسافروں کے سیلاب میں گم ہو جاتی تھی۔ ایک بار وہ بالکل ہی گم ہو گئی میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا' ہر عورت کے چہرے کو اور اس بالوں کو دیکھا مگر وہ پھول نظر نہیں آیا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ پہلے کسی اسٹاپ پر اتر گئی تھی۔ میں تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا دروازے تک آیا۔ اسی وقت بس کی رفتار سست ہو رہی تھی۔ میں نے چلتی بس سے چھلانگ لگا دی مگر سنبھل نہ سکا۔ زمین پر آتے ہی لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا' میرے جسم میں کئی جگہ چوٹیں آئیں مگر میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے کالج کا گیٹ تھا۔ میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا' میں اپنے پورے ہوش و حواس میں رہ کر یہ سمجھ رہا تھا کہ میں وہاں پہلے بھی آ چکا ہوں۔ وہ وہی جگہ ہے جہاں میں نے اس لڑکی سے ایک پھول کی فرمائش کی تھی مگر وہ نظر نہیں آ رہی تھی نہ جانے وہ کون تھی جس کا پیچھا کرتا ہوا وہاں تک آ گیا تھا۔ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ سچ مچ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ خیالی زلفوں میں ایک خیالی پھول تھا جس نے مجھے گلیوں میں گھمایا۔ بس میں بٹھایا اور اس مقام تک پہنچا دیا جو میری یادوں کی آماجگاہ ہے۔''

نثار نے ناگواری سے کہا۔

''ایمان علی تم یہ فضول داستان سننے میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس وقت ہمارا سب سے ضروری کام یہ ہے کہ ہم شہریار کو اپنے ساتھ لے جائیں اور کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر اس شہر کی تمام سڑکوں میں اس کار کو تلاش کریں۔''

شہریار نے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں تو پیدل چلتے چلتے اتنا تھک گیا ہوں کہ اب کہیں نہیں جاؤں گا۔''

نثار نے آگے بڑھ کر کہا۔

''کیسے نہیں جاؤ گے۔ تمہارا باپ بھی......۔''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شہریار نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ شہریار نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تابڑ توڑ کئی گھونسے اس کے منہ اور پیٹ پر برسا دیے۔ چند ہی بعد نثار فرش پر گر کر کراہنے لگا۔

ایمان علی خاموشی سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

''نثار تم شہریار کے باپ دادا تک پہنچ رہے تھے۔ تمہیں اس کی سزا مل گئی اگر شہریار تمہیں نہ مارتا تو میں تمہاری پٹائی کر دیتا اور اور وہ اس لیے کہ شہریار کی عزت میری ہے اور میری بہن کی عزت ہے۔ اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ جب بہن کو سہاگن بنانے کے لیے میں بے ایمانی سے دولت حاصل کر رہا ہوں۔ وہ ایمانداری سے بھی حاصل ہو سکتی ہے اور سچ پوچھو تو میں دولت کی نہیں بہن کی خوشیوں کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ اس لیے اب تم یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔''

یہ کہہ کر اس نے نثار کا کالر پکڑ کر جھٹکا دیا اور اسے زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اسی طرح کالر پکڑتے ہوئے اسے دروازے تک لایا اور اسے گھر سے باہر دھکا دیتے ہوئے بولا۔

''اب جاؤ یہاں سے پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔''

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

نثار نے باہر آ کر اپنی قمیض کا کالر درست کیا اور دروازے کی طرف مکا دکھاتے ہوئے بولا۔

''اچھا بیٹے ایمان میں نے اس بے عزتی کا بدلہ نہ لیا تو میرا نام نثار نہیں۔''

وہ غصہ سے تلملاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ایمان علی اب شہریار سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اپنی بہن کو سہاگن بنانے کے لیے اس سے اہم باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ جبار صدیقی کے سامنے ممکن نہیں تھا اس نے سوچا کہ وہ بیچارہ شہریار کو یہاں تک پہنچانے آیا ہے' پہلے اسے چائے پلا کر رخصت کیا جائے پھر شہریار سے باتیں ہوں گی۔

اس نے ریشم کو آواز دے کر چائے بنانے کے لیے کہا۔ شہریار نے مداخلت کی۔

''ایمان میرا ایک مشورہ ہے۔ صدیقی صاحب کو شبو کے ہاں چائے پلاؤ۔''

ایمان علی فوراً ہی تہہ تک پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔

''مگر شہریار ، ہم صدیقی صاحب کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں۔ آخر یہ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟۔''

جبار صدیقی نے کہا۔

''میں خود بتائے دیتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ میرا پورا نام جبار صدیقی ہے۔ کتابیں شائع کرتا ہوں۔ چوک ثناء اللہ میں سترہ نمبر کی دکان میری ہے۔ اگر کل صبح آپ میری دکان پر تشریف لائیں تو میری عزت افزائی ہو جائے گی۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ بیوی بچے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ فضل سٹریٹ میں میرا ذاتی مکان ہے، وہاں تمام محلے والے گواہی دیں گے کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔''

اس کی باتوں کے دوران شہریار آنگن میں چلا آیا۔

وہاں ریشم کھڑی ہوئی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر چند لمحوں تک خاموش رہے، شہریار سمجھ رہا تھا کہ اس لڑکی کے دل میں ہمدردی اور بہت سے جانے پہچانے جذبے طوفان بن گئے ہوں گے اور وہ ٹھیک ہی سمجھ رہا تھا۔ ریشم اس طوفان میں تنکے کی طرح اڑی جا رہی تھی۔ بہت ہی صبر وضبط سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے سر جھکا کر لرزتی ہوئی آواز میں ہولے سے کہا۔

''میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں آپ کسی سے کہیں گے تو نہیں۔''

''تم نے پہلے بھی اپنے بھائی جان کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ وہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ مجھے ابھی اس کے پاس لے چلو۔''

وہ کچھ شرماتی ہوئی اور کچھ گھبراتی ہوئی بولی۔

''آپ صبر سے کام لیجیے۔ میں ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔''

''کیوں نہیں بتا سکتیں؟۔''

''بھائی جان یہاں موجود ہیں۔وہ چلے جائیں گے تو میں بتاؤں گی۔''

''وہ صدیقی صاحب کو لے کر ابھی شبو کے ہاں جائیں گے وہاں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔صدیقی صاحب شبو سے کچھ باتیں کریں گے۔ظاہر ہے کہ تمہارے بھائی بھی نجو سے باتیں کیے بغیر نہیں آئیں گے۔ اس وقت تم مجھے بتا سکتی ہو مگر میں تم سے ایک التجا کرتا ہوں۔اتنا بتا دو کہ وہ لڑکی یہاں سے کتنی دور ہے یا کتنی قریب ہے۔''

وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

''وہ قریب ہے۔''

''کیا تم اس لڑکی سے التجا کرو گی کہ وہ مجھے بھٹکنے سے بچا لے میں نے خوابوں اور خیالوں میں اسے دیکھ کر یہی سمجھا ہے کہ غلطی اس لڑکی کی ہے اگر وہ مجھے پھول دینے سے انکار نہ کرتی تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔تم اسے سمجھا سکتی ہو کہ جو شخص دیوانگی کی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔وہی تمام عمر تمہاری قدر کر سکتا ہے۔اسے پھول پیش کرنے میں کوئی برائی یا شرم کی بات نہیں ہے۔''

''مم ، میں اس سے کہوں گی۔''وہ جلدی سے باورچی خانہ میں چلی گئی۔

شہر یار آنگن میں کھڑا باورچی خانہ کی طرف دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔پھر اس نے ایمان علی کو آواز دی۔

ایمان علی نے آنگن میں آ کر کہا۔

''صدیقی صاحب تو بہت ہی شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔وہ شبو کی پچھلی زندگی کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔پھر بھی اسے اپنی شریک حیات بنانا چاہتے ہیں۔کیا تم نے شبو کے متعلق کچھ کہا تھا۔''

''ہاں میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ جھوٹ نہیں چھپتا' ایک نہ ایک دن ظاہر ہو جاتا ہے۔اس لیے میں نے ایمانداری سے ساری باتیں بتا دی ہیں۔ایمان علی ! ایمان بڑی چیز ہے۔صدیقی صاحب اسی سچائی سے متاثر ہو کر شبو کو اپنی پناہ میں لینا چاہتے ہیں۔تم شبو کو بھی سمجھا دو کہ وہ صدیقی صاحب سے کچھ نہ چھپائے۔ایک شریف آدمی نصیب سے مل رہا ہے تو اسے بھی اپنی سچائی اور شرافت کا ثبوت دینا چاہیے۔''

''اچھی بات ہے۔تم صدیقی صاحب سے باتیں کرو۔میں شبو کے ہاں جاتا ہوں۔وہاں چائے ناشتے کا

انتظام کر کے انہیں بلاؤں گا۔''

شہر یار وہاں سے جبار صدیقی کے پاس چلا گیا۔

ایمان علی آنگن میں تنہا رہ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باورچی خانہ کے دروازے پر آیا۔ اتنی رات کو باورچی خانہ میں کوئی کام نہیں تھا مگر ریشم وہاں سر جھکائے بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔

ایمان علی دروازے کی آڑ میں ہو گیا اور بہن سے چھپ کر آواز دی۔

''ریشم۔''

ریشم خیالات سے چونک گئی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ بھائی نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کی آواز آ رہی تھی۔

''ریشم ابھی کچھ دیر پہلے شہر یار نے نیو کیمپس تک پہنچنے کی جو داستان سنائی ہے۔ اسے تم نے بھی سنا ہو گا اور میں نے بھی سنا ہو گا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شہر یار ہی تمہارا بہترین جیون ساتھی بن سکتا ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ شہر یار کی والدہ میری غریب بہن کو بہو بنانا پسند نہیں کریں گی۔ لیکن وہ جتنی دیوانگی سے تمہیں تلاش کر رہا ہے' اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی والدہ کو اس رشتے کے لیے راضی کر لے گا۔

ریشم میں صرف تمہاری خوشیاں چاہتا ہوں۔ ابھی شہر یار نے کہا ہے کہ ایک شریف آدمی نصیب سے مل رہا ہے تو شبو کو بھی نہایت شرافت سے اپنی سچائی ظاہر کر دینا چاہیے۔ مجھے یوں لگا جیسے شہر یار نے شبو کو نہیں مجھے کہا ہے کہ جھوٹ کبھی نہیں چھپتا۔ ایک نہ ایک دن ظاہر ہو جاتا ہے۔ اب مجھے عقل آئی ہے کہ اگر میں بے امانی سے تمہیں دلہن بناؤں اور بعد میں حقیقت کھل جائے تو تمہاری سسرال میں سب ہی طعنے دیں گے۔ تم اک بے ایمان کی بہن ہو۔ اب مجھے عقل آئی ہے کہ بے ایمانی سے وقتی فائدہ ضرور حاصل ہو گا۔ مگر آئندہ کبھی میری بہن کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

لہذا اب میں نے اہم فیصلہ کیا ہے کہ ہم سب مل کر شہر یار کو اس کی گمشدہ زندگی کی یاد دلائیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ تم ہی اس کی یادداشت واپس لا سکتی ہو۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جو اپنے بالوں میں اب پھول نہیں لگاتی ہو۔ اب تمہیں پھول لگانا چاہیے' ریشم اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تم تعلیم یافتہ

ہو۔ سمجھ دار ہو۔ ایک انسان جو راستے سے بھٹک گیا ہے۔ اسے اس کے گھر کا راستہ دکھا دو۔''

یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

ریشم ایک دم سے ہلکی پھلکی ہوگئی۔ اچانک ہی بے ایمان زندگی کا بوجھ سر سے اتر گیا تھا۔ اب وہ فخر سے کہہ سکتی تھی کہ وہ ایمان علی جیسے ایمان دار بھائی کی بہن ہے۔

☆☆☆☆

نثار دبے قدموں کوٹھی کے برآمدے میں پہنچا' رات زیادہ ہوگئی تھی اسے اطمینان تھا کہ بیگم بشارت، زینت آپا اور وقار علی اپنے کمروں میں گہری نیند سو رہے ہوں گے رقیہ بھی بچوں کے ساتھ رہی ہوگی۔ اس وقت کوئی اس سے پوچھنے والا نہ تھا کہ وہ کار کہاں چھوڑ آیا ہے۔

وہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پاس آ کر شیشوں کے پار دیکھنے لگا۔ وہاں ایک صوفہ پر ملازم سو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کے شیشوں پر ہولے ہولے دستک دی۔ ملازم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر نثار کو دیکھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔

وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس کی توقع کے خلاف رقیہ جاگ رہی تھی' اس کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔

''تم ابھی جاگ رہی ہو۔''

رقیہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے گھور گھور کر اسے دیکھتی رہی۔ دیکھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ابھی اسے کچا چبا جائے گی۔ نثار نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلی بار اسے توجہ سے دیکھا۔ پھر حیرانی سے پوچھا۔

''کیا بات ہے۔ کیا تم رو رہی تھیں۔ یہ تم مجھ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو۔''

وہ نفرت سے کہنے لگی۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میرے خاوند ہو یا آستین کے سانپ.......''

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم ہوش میں تو ہو۔''

"پہلے ہوش میں نہیں تھی۔اب تمہاری فہمیدہ کا خط پڑھ کر ہوش میں آ گئی ہوں۔''

''کس کی فہمیدہ۔کون فہمیدہ..........صاف صاف کہو۔تم کہنا کیا چاہتی ہو۔''

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

''ایسے پوچھ رہے ہو۔جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔وہ جوان چھوکری ہے۔میں تین بچوں کی ماں ہوں۔تم مجھے طلاق دینا چاہتے ہو مگر ابھی اس لیے مجبور کہ میں تمہاری ناجائز آمدنی کا راز جانتی ہوں۔مجھے طلاق دو گے تو میں خالہ جان کے سامنے راز اگل دوں گی۔''

وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔میں نے تمہیں طلاق دینے کے متعلق کبھی نہیں سوچا نہ جانے کس لڑکی نے آکر تمہیں بہکا دیا ہے۔''

رقیہ نے اپنے پرس سے وہ خط نکال کر پھینک دیا۔

''میرے پاس کوئی لڑکی نہیں آئی تھی۔یہ خط ڈاک کے ذریعہ آیا ہے اسے پڑھو اور شرم آئے تو کہیں جا کر ڈوب مرو۔میں تو جیتے جی مر گئی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ پلنگ کے سرے پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔

نثار اس خط کو زمین سے اٹھا کر پڑھ رہا تھا۔پھر اسے پڑھنے کے بعد اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''واقعی عورت بیوقوف ہوتی ہے۔برسوں کی رفاقت کو بھول کر ایک کاغذ کے ٹکڑے پر بھروسا کرتی ہے۔ رقیہ آنسو بہانے کی بجائے سمجھنے کی کوشش کرو کہ کسی نے میرے خلاف سازش کی ہے۔''

''کون ہے ہمارا دشمن جو سازش کرے گا۔ہم جس سے دشمنی کر رہے ہیں۔وہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے وہ اس قسم کی سازش کر ہی نہیں سکتا۔''

''تم یہ بتاؤ کہ یہ خط کس پتے پر آیا ہے۔''

''تم جان بوجھ کر کیوں پوچھتے ہو۔جس پتے پر تمہارے خطوط آتے ہیں اسی پتے پر آیا ہے۔''

''ہوں یعنی ہوٹل کے پتے پر خط آیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منیجر بشیر کی شرارت ہے۔تم یہ سمجھ رہی تھی کہ صرف شہریار ہی دشمنی کرسکتا ہے۔تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ ہم روزانہ بشیر کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ہوٹل کی آمدنی سے ہمیں چار پانچ سو روپے دیتا رہے۔کیا وہ مجھ سے دشمنی نہیں کرسکتا۔سچ سچ بتاؤ۔کیا یہ خط اس نے تمہیں نہیں دیا ہے۔''

رقیہ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔یہ بات بھول گئی تھی کہ منیجر بشیر بھی ان سے دشمنی کرسکتا ہے۔

نثار نے بڑی محبت سے اس کے بازو کو تھام کر کہا۔

''میری رقیہ وہ کمبخت ہم دونوں کو لڑانا چاہتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ تم کسی ہونے والی سوکن کا خط پڑھ کر آپے سے باہر ہو جاؤ اور غصہ کی حالت میں یہ راز فاش کردو کہ تمہارا خاوند ہوٹل کی آمدنی میں بے ایمانی کررہا ہے۔ایک دشمن کی چال کو سمجھو رقیہ۔کیا تم اپنے نثار کو بے وفا سمجھتی ہو۔میں تمہاری جیسی حسین اور وفادار بیوی کے سامنے فہمدہ جیسی ہزار لڑکیوں کو ٹھوکر مار سکتا ہوں۔مجھ پر بھروسہ کرو۔''

رقیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''نثار تم مجھے چھوڑ دو گے تو میں مر جاؤں گی۔مجھے دولت نہیں چاہئے۔مجھے عیش وآرام نہیں چاہیے۔میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔تم قسم کھاؤ۔بچوں کی قسم کھاؤ ، کہ مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے۔''

وہ بڑی بڑی قسمیں کھانے لگا' اپنی محبت اور وفاداری کا یقین دلانے لگا۔پھر اس نے کہا۔

''اب میں اس منیجر سے ایسا انتقام لوں گا کہ وہ بھی یاد کرے گا۔پتا نہیں صبح اٹھ کر کس کا منہ دیکھا تھا۔آج میں جہاں بھی گیا ناکامیوں اور پریشانیوں کا سامنا ہوتا رہا۔''

پھر وہ بتانے لگا کہ کس طرح شہریار اس کی کار لے گیا تھا اور اسے کہیں چھوڑ آیا ہے۔اس کار کے گم ہونے کی وجہ سے وہ رات بھاگ دوڑ میں گزر رہی ہے آج اسے سونا نصیب نہیں ہوگا پھر یہ کہ ایمان علی نے شہریار کے سلسلے میں ان کا ساتھ دینے سے انکار کردیا ہے۔

یہ آخری بات رقیہ کو تشوش میں مبتلا کررہی تھی۔شہریار کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہی تھا کہ خزانے کی کنجی ہاتھ سے نکل رہی ہے۔وہ گھبرا کر بولی۔

''اب کیا ہوگا۔ ایمان علی اگر شہریار کو لے کر یہاں پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔''

یہ بہت اہم سوال تھا۔ دونوں کی بدنیتی اور جرم بیگم بشارت کے سامنے آ سکتا تھا۔ نثار اسی سوال کا جواب سوچتا ہی رہ گیا۔ اتنے میں اچانک ہی کال بیل کی آواز سنائی دی۔

وہ دونوں خوف سے تھرا گئے۔ رات کے سناٹے میں گھنٹی کی آواز ایک دھماکے کی طرح گونج رہی تھی۔

رقیہ سہم کر بولی۔

''یہ ، یہ اتنی رات کو کون آیا ہے۔ نثار ! کہیں وہ لوگ شہریار کو لے کر تو نہیں آ گئے۔''

نثار بھی اسی اندیشے سے لرز رہا تھا۔

''ہاں رقیہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی ایمان علی ہے۔ شہریار کو ساتھ لایا ہے۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دروازے کے پاس آئے وہاں سے نکل کر کاریڈور میں پہنچ اور ایک کھڑکی سے ڈرائنگ روم کی طرف دیکھنے لگی۔

ڈرائنگ روم میں سونے والے ملازم نے بیرونی دروازہ کھول دیا تھا۔ دروازے پر ایک پولیس انسپکٹر نظر آ رہا تھا۔ وہ ملازم سے کہہ رہا تھا۔

''بیگم صاحبہ سے جا کر کہو۔ ان کے رحمان بھائی ملنے آئے ہیں میں جانتا ہوں کہ اس وقت وہ گہری نیند میں ہوں گی لیکن میرا نام سن کر چلی آئیں گی۔''

ملازم بیگم بشارت کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ رقیہ نے نثار کے قریب ہو کر آہستگی سے پوچھا۔

''یہ انسپکٹر کون ہے۔ کیوں آیا ہے۔''

نثار نے جواب دیا۔

''یہ شہریار کے والد کے گہرے دوست تھے۔ ان کی موت کے بعد بھی دوستی نبھا رہے ہیں۔ اکثر خالہ جان کی خیریت پوچھنے چلے آتے ہیں۔''

''مگر یہ بھی کوئی وقت خیریت پوچھنے کا ہے۔ رات کے تین بج رہے ہیں۔'' نثار نے تشویش کا اظہار کیا۔

''پتا نہیں کیا بات ہے۔ رقیہ ! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ یہ رحمان صاحب کہیں

شہر یار کی خبر نہ لائے ہوں یا ، یا ہوسکتا ہے کہ کہیں راستے میں انہیں شہر یار کی کار مل گئی ہو۔ ہاں رقیہ ! یہی ہوسکتا ہے۔ میں ، میں کہیں چھپ جاتا ہوں۔ اگر خالہ جان پوچھیں گی تو کہہ دینا کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ میں کل صبح کار کے سلسلے میں کوئی بہانہ کروں گا۔''

ڈرائنگ روم بیگم بشارت آ گئی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی انسپکٹر نے کہا۔

''بھابھی آداب۔''

''آداب خیریت تو ہے رحمان بھائی ! اتنی رات کو کیسے آ گئے ؟۔''

''شہر یار کی کار مجھے راستے میں ملی ہے۔ میں یہ پوچھنے آیا ہوں کیا شہر یار واپس آ گیا ہے۔''

بیگم بشارت نے سرد آہ بھر کر اداسی سے کہا۔

''نہیں بس امید پر زندہ ہوں۔ عامل صاحب نے یقین دلایا ہے کہ دو چار روز میں ضرور آ جائے گا۔''

''اللہ پر بھروسہ رکھیے بھابی وہ جہاں بھی ہوگا خیریت سے ہوگا اور جلد ہی آپ کے پاس آ جائے گا۔ آپ یہ بتائیں کہ شہر یار کی کار ان دنوں کس کے استعمال میں ہے۔''

''میرا ایک بھانجا ہے نثار۔ آج کل وہی کاروبار سنبھال رہا ہے۔ وہ کار بھی اسی کے استعمال میں رہتی ہے لیکن وہ راستے میں کہا۔ں تھی۔ نثار کہاں ہے۔''

انسپکٹر رحمان نے جواب دیا۔

''اگر وہ آپ کے بھانجے ہیں تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کہیں شراب کے نشے میں مدہوش ہوں گے۔ مجھے اس کار میں شراب کی ایک بوتل ملی ہے۔''

اسی وقت زینب آپا اور وقار علی بھی آ گئے۔ وقار علی نے انسپکٹر کی بات سن کر کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لڑکے نے پھر شراب پینی شروع کر دی ہے۔''

بیگم بشارت نے تعارف کرایا

''رحمان بھائی۔ یہ میری بڑی بہن ہیں اور یہ میرے بہنوئی وقار علی ہیں۔''

انسپکٹر نے پوچھا۔

''یہ رقیہ بیگم کون ہیں؟۔''

"ہماری بہو یعنی نثار کی شریک حیات ہے۔ بات کیا ہے۔ آپ کو رقیہ کا نام کیسے معلوم ہوا؟۔''

''میں ابھی بتاتا ہوں۔ آپ یہ بتایئے کہ نثار صاحب بشارت مرحوم کا کاروبار کب سے سنبھال رہے ہیں

۔''

''جب سے شہریار لاپتا ہوا ہے۔تقریبا" ڈیڑھ ماہ سے............۔''

''اس سے پہلے نثار صاحب کیا کرتے تھے؟''

اس بار وقار علی نے جواب دیا

''وہ بے کار تھا۔ میرے پاس جو تھوڑی بہت پونجی تھی اسے الٹے سیدھے کاروبار میں ضائع کر دیا۔ہم بالکل تباہ ہو گئے میرے بنک اکاونٹ میں صرف دس روپے پڑے ہیں۔''

''تعجب ہے؟''انسپکٹر نے کہا۔ ''آپ کیسے تباہ ہو سکتے ہیں۔آپ کی بہو رقیہ بیگم کے بنک اکاؤنٹ میں پندرہ لاکھ روپے ہیں یہ کوئی معمولی رقم تو نہیں ہے۔''

وقار علی حیرانی سے منہ کھول کر بیگم بشارت کو دکھنے لگے۔زینب آپا نے کہا۔

''خدا گواہ ہے کہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ دلہن نے اتنے پیسے جمع کر رکھے ہیں۔''

اسی وقت رقیہ ڈرائنگ روم میں آ کر کہنے لگی۔

''ہاں میرے اکاؤنٹ میں پندرہ لاکھ ہیں۔ یہ چوری کے پیسے نہیں ہیں۔ میرے بھائی کی محنت کی کمائی ہے۔ وہ بھابھی سے چھپا کر مجھے امانت کے طور پر رکھنے کے لیے دیتے ہیں۔تاکہ کبھی برے وقت میں کام آئیں۔''

زینب آپا نے ناگواری سے کہا۔

''دلہن تمہارا بھائی ایک معمولی کلرک ہے۔اسے تین ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں۔اس نے دو سال کی ملازمت میں اتنی بڑی رقم کیسے جمع کر لی؟۔''

رقیہ چیخ کر بولی۔

''میرے میکے والے آپ لوگوں کی طرح کنگال نہیں ہیں۔ہم پیسے جوڑنا جانتے ہیں۔ابا جان کے وقت سے یہ روپے جمع ہوتے رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بیگم نثار............''انسپکٹر نے بینک کی اکاؤنٹ بک جیب سے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''میں آپ سے پندرہ لاکھ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا۔مگر نثار صاحب کہاں ہیں۔ میں ان سے پوچھوں گا کہ آپ کی ہونے والی سوکن کے اکاؤنٹ میں دس لاکھ کہاں سے آ گئے ہیں؟۔''

''ہونے والی سوکن............؟۔''

یہ بات سن کر سب ہی بے یقینی سے انسپکٹر رحمان کو دیکھنے لگے۔مگر رقیہ کا یقین جو ابھی نثار نے بحال کیا تھا' قسمیں کھا کر کہا تھا کہ وہ اس کی سوکن نہیں لائے گا۔رقیہ کا وہ یقین ڈگمگا گیا۔ایک باہر کا آدمی' غیر آدمی وہ بھی پولیس انسپکٹر بڑے اعتماد سے کہہ رہا تھا کہ اس دنیا میں اس کی سوکن کا وجود ہے اور اس کے وجود کے اکاؤنٹ میں نثار نے دس لاکھ جمع کیے ہیں۔اسے سوکن کی گالی یاد آ گئی۔

رقیہ غصہ سے نفرت سے صدمہ سے تھر تھر کانپنے لگی۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ کر ٹھہر گئے تھے۔ایک عورت کے اندر سے سیلاب امنڈنے ہی والا تھا۔

زینب آپا نے پریشان ہو کر انسپکٹر سے پوچھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ نثار دوسری شادی کرنے والا ہے۔''

انسپکٹر رحمان نے کہا۔

''محترمہ میرے پاس آپ کے بیٹے کی ہونے والی ساس کی تحریر ثبوت کے طور پر موجود ہے لیکن یہ ثبوت دکھانے سے پہلے میں بگم نثار سے پوچھتا ہوں کہ وہ کسی فہمیدہ کو جانتی ہیں۔بیگم نثار ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیں کیونکہ آپ سب کچھ برداشت کر سکتی ہیں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ کا خاوند آپ کی سوکن کے اکاؤنٹ میں دس لاکھ کا اضافہ کرے۔اگر آپ انکار کریں گی۔تو میں یہ ثبوت پیش کروں گا۔''

اس نے اپنی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔

''یہ خط نثار کی ہونے والی ساس نے ڈاک خانے کے ایک منشی سے لکھوایا ہے۔آپ کے خاوند آپ کی

سوکن کے لیے آم کے باغات خرید رہے ہیں۔ یہ رقم قسطوں میں ادا کی جائے گی۔ ابھی نثار صاحب کے بھیجے ہوئے روپے پیشگی کے طور پر ادا کر دیے گئے ہیں۔''

''نہیں ا'' رقیہ نے اچانک ہی ایک چیخ ماری۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی زبان آندھی طوفان کی طرح چل پڑی۔

''میں اس کی بوٹیاں نوچ لوں گی۔ اس کے لیے آم کے باغات خریدے جا رہے ہیں۔ میں تین بچوں کی ماں ہوں۔ نثار ، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں مروں گی تو تمہیں بھی اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔ بے وفا ہرجائی طوطے کی طرح آنکھیں پھیرنے والے مجازی خدا کیا اسی دن کے لیے خاوند کو مجازی خدا کہا جاتا ہے۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی اور اپنا بھانڈا آپ پھوڑ رہی تھی۔

''چپ ہو جاؤ۔ چپ ہو جاؤ۔'' بیگم بشارت نے کہا۔

مگر وہ بولتی رہی۔ وقار علی نے ڈانٹ کر خاموش ہو جانے کے لیے کہا مگر اس پر جنون سوار تھا۔ وہ اک ان دیکھی سوکن سے شکست کھا رہی تھی ازدواجی زندگی کی بازی میں اپنے خاوند کو ہار رہی تھی وہ کیسے چپ ہو سکتی تھی۔

اچانک ہی زینب آپا نے آگے بڑھ کر ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ ہی رقیہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی اور صوفے پر گر پڑی۔ طمانچہ کھاتے ہی اسے ہوش آ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے سامنے کھڑے ہوئے افراد کو دیکھنے لگی۔

زینب آپا نے غصہ سے کہا۔

''ہمیں جس گھر میں پناہ ملی تم اور نثار اسی گھر کو آگ لگا رہے ہو۔ دلہن ! تم نے یہ نہیں سوچا کہ تمہاری زندگی میں بھی کوئی سوکن آگ لگانے آ سکتی ہے۔ بتاؤ کہاں ہے نثار؟''

جو راز تھا۔ وہ اگل چکی تھی۔ اب چھپانے کے لیے کچھ نہ رہا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

''وہ پلنگ کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔''

وقار علی غصہ سے کانپتے ہوئے رقیہ کے کمرے کی طرف جانے لگے۔

''نامعقول ناہنجاز میں ابھی سے پکڑ کر لاتا ہوں۔''

ان کے جانے کے بعد انسپکٹر رحمان نے بیگم بشارت کو وہ خط دے دیا۔

اتنے میں وقار علی اپنے بیٹے نثار کو گریبان سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے اور اسے انسپکٹر کے سامنے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''اس نے دلہن کی تمام باتیں سن لی تھیں اور راز فاش ہوتے دیکھ کر پچھلے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن میں نے پکڑ لیا۔ اب آپ اسے حوالات میں بند کر دیجیے۔''

نثار جلدی سے آگے بڑھ کر بیگم بشارت کے قدموں میں لپٹ گیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔

''خالہ جان مجھے معاف کر دیجیے۔ میں ذلیل ہوں۔ چور ہوں بے ایمان ہوں۔ مگر آپ رحم دل ہیں۔ میں آپ کا بچہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔''

بیگم بشارت نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جاؤ میں نے تمہیں اور دلہن کو معاف کیا۔ تمہیں اگر رحمان بھائی کے حوالے کروں گی اور تم جیل جاؤ گے تو ہمارے ہی خاندان کی بدنامی ہوگی۔''

رقیہ یک بیک صوفے سے اچھل کر بولی۔

''نہیں خالہ جان۔ آپ ہمیں معاف نہ کریں۔ میں جیل جاؤں گی تو نثار کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ خدا کی قسم جیل ایک ایسی جگہ ہے جہاں یہ میرے لیے سوکن نہیں لا سکیں گے۔ جہاں مجھ جیسی عورت سونے کے زیورات کا لالچ نہیں کرے گی۔''

نثار نے پلٹ کر عاجزی سے کہا۔

''میں خدا کو حاضر و ناضر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے کبھی دوسری شادی کے متعلق نہیں سوچا یہ میرے خلاف سازش ہے۔ کوئی خیالی سوکن اور خیالی ساس کی طرف سے مجھے خط لکھ رہا ہے۔''

رقیہ نے تلملا کر کہا۔

''اب میں تمہارے فریب میں نہیں آ ؤں گی۔اب میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ مرد کے ہاتھ میں دولت آتی ہے تو اسے کتنی چربی چڑھ جاتی ہے۔انسپکٹر صاحب آپ ہم دونوں کو حراست میں لے لیجیے۔کیونکہ ہم نے صرف چوری نہیں کی ہے۔اس سے بھی بڑا جرم کیا ہے۔ہم دونوں نے شہر یار کو خالہ جان سے دور لے جا کر چھپا رکھا ہے۔''

رقیہ کا یہ اظہار جرم سب کے لیے ایک دھما کہ ثابت ہوا۔'کہاں ہے شہر یار۔کہاں چھپایا ہے اسے۔کیوں چھپایا ہے۔کب سے چھپایا ہے۔'

"میرا بچہ ا'' بیگم بشارت چیختی ہوئی رقیہ کے پاس آ ئیں اور اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑتی ہوئی بولیں۔''کہاں ہے میرا لعل۔تم لوگوں نے اسے کیوں چھپایا ہے۔یہ کیسی دشمنی ہے دلہن۔میں تمہارے بچوں کو سونے کا نوالہ کھلاتی ہوں اور تم میرے بچے کو مجھ سے چھین کر دور لے گئی ہو۔کیسی ماں ہو تم تمہیں تمہاری ممتا کا واسطہ مجھے میرے بچے کے پاس لے چلو اس کے بدلے میری ساری دولت لے لو۔''

بیگم بشارت یہ کہتی ہوئی رقیہ کے قدموں میں گر پڑیں۔

☆☆☆☆

ایمان علی ، جبار صدیقی کو لے کر شبو کے ہاں چائے پینے چلا گیا تھا۔ان کے جانے کے بعد شہر یار نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔پھر اس نے ریشم سے کہا۔

''اب بتاؤ تم اس لڑکی کے متعلق کیا جانتی ہو۔کیسے جانتی ہو؟۔'' ریشم نے سر جھکا لیا۔اس کا چہرہ حیا سے تمتما رہا تھا وہ ہولے سے بولی۔''آپ دوسرے کمرے میں جائیں۔میں اس لڑکی کو آپ کے پاس بھیج دوں گی۔''

شہر یار نے خوش ہو کر پوچھا۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو۔کیا وہ لڑکی ابھی یہاں آ سکتی ہے۔''

''جی ہاں آپ اس کمرے میں جایئے۔''

شہر یار دوسرے کمرے میں جانے لگا۔ ریشم نے کہا۔

''جب تک میں نہ کہوں۔آپ کمرے سے باہر نہ آئیں۔''

''نہیں آؤں گا۔'' وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ریشم اپنے سینے پر ہاتھ رکھے دل کی دھڑکنوں کی ذرا دیر تک سنبھالتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آنگن میں آئی وہاں ایک پودے سے اس نے ایک پھول توڑا اور اسے لے کر پھر اس کمرے میں آ گئی۔اس نے پھول کو آئینے کے قریب رکھا۔ کنگھی اٹھا کر بال سنوارنے لگی۔اس کے بعد اس نے پھول اٹھا کر اپنی زلفوں میں اسے ٹانک دیا۔

وہ پھول واقعی ایک سنگار تھا۔اس کے بالوں میں سجتا تھا اور اس کے حسن میں اضافہ کرتا تھا۔

اس کا رنگ روپ ہی بدل گیا تھا۔وہ شہر یار کے کمرے کی طرف چلی تو اس کی چال ہی بدل گئی۔

وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔شہر یار بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔اسے دیکھتے ہی وہ بھی ایک جھٹکے سے رک گیا اور اسے یوں دیکھنے لگا۔ جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ یوں سوچتی ہوئی نگاہوں سے تکنے لگا جیسے خوابوں میں آنے والی دوشیزہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

ریشم اس کی سوچتی ہوئی نظروں سے نظریں نہ ملا سکی اس نے شرما کر سر کو جھکا لیا اور لرزتے ہوئے قدموں اور دھڑکتے ہوئے دل سے کمرے کے اندر آ گئی۔

شہر یار نے انگلی اٹھا کر جذباتی لہجے میں کہا۔

''تم ہتم وہی ہو۔ ریشم ! یہ تمہارے بالوں میں لگے ہوئے پھول نے میرے خوابوں میں آنے والی دوشیزہ کی تصویر مکمل کر دی ہے۔''

وہ کسی شرابی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا۔

''پہلے صرف پھول نظر آیا تھا۔چہرہ چھپ جاتا تھا۔آج یہ چہرہ میرے خوابوں کی تعبیر بن گیا ہے۔تم وہی ہو۔آہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔میرا سر گھوم رہا ہے۔کتنی ہی یادیں روشن ہو رہی ہیں۔''

ریشم نے جلدی سے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک دم سے گھبرا گئی شہر یار دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے

آگے پیچھے یوں ڈگمگا رہا تھا۔ جیسے اب تب میں گرنے ہی والا ہو۔

وہ جلدی سے دوڑتی ہوئی اس کے سامنے آئی اور سہارا دینے کے انداز میں اس کے دونوں شانوں کو تھام کر بولی۔

''یہ ، یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟۔''

"مم ، مجھے میرے دماغ میں روشنی کے جھماکے ہو رہے ہیں۔ مجھے بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔''

''ریشم ، میری ریشم میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔تم وہی ہو جسے میں نے کالج کے گیٹ کے سامنے دیکھا تھا۔ بولو تم وہی ہو نا۔''

"ہاں میں ، میں وہی ہوں۔''

''مجھے یاد آ رہا ہے۔ میں کار میں بیٹھا ہوا تھا اور تم سڑک پر گری ہوئی کتابیں اٹھا رہی تھیں۔ کیا ایسا ہو چکا ہے۔ میری مدد کرو۔''

''ہاں ، ایسا ہو چکا ہے آپ کو سب کچھ یاد آ رہا ہے۔''

''مجھے یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ میں نے تم سے پھول مانگا تھا۔''

''آں ا'' وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ ''ہاں آپ نے پھول مانگا تھا۔ مم ، میں نے دینے سے انکار کیا تھا۔''

''کیوں انکار کیا تھا ریشم۔ کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟۔''

''نہیں............۔''

''تو پھر محبت کرتی ہو'' وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچانے لگی۔

''جواب دو ریشم ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے انکار سے مجھے صدمہ پہنچے اور میں پھر سب کچھ بھول جاؤں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں آپ نہیں بھول سکتے۔ میں آپ کو بھولنے نہیں دوں گی۔ میں نے پھول دینے سے انکار کیا تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ کیا ، کیا یہ پھول اب آپ کے پاس نہیں آ گیا ہے۔''

پھر اچانک ہی موٹر گاڑیوں کی آواز سے رات کا سناٹا گونجنے لگا۔ شہر یار جلدی سے کھڑکی کے پاس آیا

اور اسے کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

سب سے پہلے پولیس کی ایک جیپ نظر آئی۔اس میں سے پانچ سپاہی اتر کر مکان کے چاروں طرف پھیل رہے تھے اور انسپکٹر رحمان للکار رہا تھا۔

''ایمان علی مکان سے باہر آؤ۔یاد رکھو اگر تم نے شہر یار کو ذرا بھی نقصان پہنچایا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

انسپکٹر رحمان کے پیچھے نثار کھڑا ہوا تھا۔اس دیکھتے ہی شہر یار سمجھ گیا کہ وہ ایمان علی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے پولیس کے ساتھ آیا ہے۔ان سے ذرا دور شہر یار کی کار کھڑی تھی اور اس میں سے وقار علی ،بیگم بشارت ،رقیہ اور زینب آپا باہر نکل رہی تھیں۔

شہر یار نے وہیں کھڑکی سے انسپکٹر رحمان کو آواز دی۔

''انکل اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیجیے۔میں یہاں خیریت سے ہوں' ایمان علی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ٹھہریے میں آ رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے کھڑکی بند کی پھر ریشم کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''نثار تمہارے بھائی کو مجرم ثابت کرنے آیا ہے مگر تم فکر نہ کرو۔آنگن میں جاؤ۔میں اپنی امی وغیرہ کو یہاں بلاتا ہوں۔''

وہ ریشم کو تسلی دے کر باہر آیا تو ایمان علی اور جبار صدیقی بھی شبو کے گھر سے نکل کر آ گئے تھے۔انسپکٹر رحمان ان سے باتیں کر رہا تھا۔بیگم بشارت شہر یار کو دیکھتے ہی اسے پکارتے ہوئے آگے بڑھیں۔شہر یار دوڑتے ہوئے آ کر ان سے لپٹ گیا۔

''میرے لعل۔تم کہاں کھو گئے تھے۔سچ سچ بتاؤ تمہیں کس نے قید کر رکھا تھا۔''

شہر یار نے اپنے پاس دیکھا۔اتنی رات کو پولیس کی گاڑی دیکھ کر محلے کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔شہر یار نے کہا۔

''مجھے کسی نے قید نہیں کیا تھا۔آیئے اندر چلیے۔ایمان علی تو بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے میری حفاظت

کی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی زینب پھوپھی سے لپٹ گیا۔ پھر وقار علی سے بغلگیر ہوا۔ اس کے بعد ان سب کو اپنے ساتھ لے کر مکان کے اندر آ گیا۔ ایمان علی شبو کے ہاں سے دو کرسیاں اٹھا کر لے آیا۔ انسپکٹر رحمان نے شہریار سے کہا۔

''بیٹے ہمیں تو نثار نے کہا ہے کہ ایمان علی تمہاری یادداشت گم ہونے سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور تمہیں یہاں چھپا کر رکھنے کا معقول معاوضہ نثار سے لے رہا ہے۔''

''بات کسی حد تک درست ہے۔ ایمان علی نے اپنی غربت اور محتاجی سے مجبور ہو کر یہاں رکھا ہے۔ لیکن مجھے یہاں رکھنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ میری حفاظت کر رہا تھا۔ نثار مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا لیکن ایمان علی میری جان کا دشمن نہیں تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' نثار نے کہا۔ ''شہریار تمہیں ایمان علی نے بہکایا ہے۔ میں تمہاری جان کا دشمن نہیں ہوں۔''

شہریار نے نفرت سے کہا۔

''نثار کیا تم بھول گئے کہ یہاں میں نے تمہاری کیسی پٹائی ہے۔ بے وقوف آدمی! تم سمجھ رہے تھے کہ میری یادداشت گم ہوگئی ہے۔ لیکن میں جان بوجھ کر تم لوگوں کے سامنے یہ ڈرامہ کھیل رہا تھا۔ کیا اب بھی تمہارے سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر میں پچھلی زندگی کو بھول چکا ہوتا تو امی جان، پھوپھی جان اور تمام عزیزوں اور بزرگوں کو نہ پہچان سکتا۔ مگر میں تو سب کو پہچان رہا ہوں' یادداشت کا اندھا بن کر سب کے اصلی چہرے دیکھ رہا ہوں۔''

اس کی امی اور پھوپھی اور انسپکٹر وغیرہ کو اب یاد آیا کہ وہ اسے بھولا بھٹکا ہوا لڑکا سمجھ رہے تھے۔ مگر وہ تو واقعی سب کو پہچان رہا تھا بیگم بشارت نے تعجب سے پوچھا۔

''پھر وہ اخبار والوں نے کیوں لکھا تھا کہ تمہاری یادداشت گم ہوگئی ہے اور جہنم میں گئے اخبار والے۔ تم اچھے بھلے تھے پھر گھر کیوں نہیں آئے۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟۔''

''امی جان! اخبار والوں نے درست لکھا تھا۔اس وقت واقعی میری یادداشت گم ہوگئی تھی۔کل صبح میری یادداشت بحال ہوئی ہے۔''

''تو پھر تم صبح کیوں نہیں آئے۔اس گھر میں کیا کر رہے ہو؟''

''امی جان آپ کے اس سوال کا جواب تنہائی میں دے سکتا ہوں۔آیئے ذرا اس کمرے میں چلیے۔ پھوپھی جان ، پھوپھا جان اور آنکل آپ بھی آیئے۔''

وہ ان چاروں کے ساتھ دوسرے کمرے میں آیا۔پھر دروازے کو بند کرنے کے بعد کہنے لگا۔

''امی جان۔آپ کو یاد ہے۔آپ نے کہا تھا کہ اگر میں نے دو دن کے اندر آپ کے لیے بہو پسند نہیں کی تو آپ خود ہی کہیں سے پسند کر کے لے آئیں گی۔''

''ہاں میں نے کہا تھا۔کیا تم یہاں بیٹھ کر بہو پسند کر رہے ہو۔''

''جی ہاں ، وہ تو پسند کر بھی چکا ہوں۔اتنی خوب صورت ہے امی جان کہ بس آپ دیکھیں گی تو دیکھتی ہی رہ جائیں گی۔کالج میں پڑھتی ہے۔بہت ہی ذہین ہے۔''

''ارے تو وہ کہاں ہے پہلے یہ تو بتاؤ۔''

"بتاتا ہوں۔دیکھیے نا میں نے سوچا کہ آج میری یادداشت واپس آگئی ہے۔لیکن میں خالی ہاتھ آپ کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔کوئی نہ کوئی تحفہ آپ کے لیے لے جانا چاہتا تھا۔اب آپ ہی کہیے بہو سے بڑھ کر بھی کوئی تحفہ ہو سکتا ہے وہ تو امی جان چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے۔''

''ہاں تمہاری پسند سے کچھ نہیں ہوگا۔لڑکی کی صرف صورت دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔سیرت پہلے دیکھنا چاہے۔اس کا مزاج دیکھنا چاہیے۔''

شہر یار جانتا تھا کہ اس کی امی اپنے ہی مزاج کی لڑکی پسند کریں گی۔اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''امی جان اس کا مزاج آپ ہی جیسا ہے۔وہ بھی یہی کہتی ہے کہ ناول لکھنا چھوڑ دیجیے۔ورنہ میں شادی نہیں کروں گی۔''بیگم بشارت خوشی سے کھل گئیں۔

''وہ ایمان علی کی چھوٹی بہن ہے۔اس کا نام ریشم ہے اور وہ اس گھر کے آنگن میں ہے۔''

بیگم بشارت یہ سنتے ہی تیر کی طرح آنگن کی طرف گئیں۔ان کے پیچھے ان کی زینب آپا بھی تھیں۔انسپکٹر نے شہریار سے کہا۔

''برخوردار تم یہ سب کیا چکر چلا رہے ہو۔''

شہریار مختصر الفاظ میں انسپکٹر رحمان اور وقار علی کو شروع سے اب تک کے واقعات بتانے لگا۔آنگن میں ریشم اچانک ہی دو معمر خواتین کو دیکھ کر سر کے آنچل کو گھونگھٹ بنانے لگی۔وہ شہریار سے سن چکی تھی کہ اس کی امی آ رہی ہیں۔لہذا اس نے سمجھ لیا تھا کہ ان میں سے ایک شہریار کی والدہ ہیں۔

گھونگھٹ نکالنے سے پہلے ہی بیگم بشارت نے ریشم کی ایک جھلک دیکھ لی تھی بیٹے نے ٹھیک ہی کہا۔تھا کہ وہ چندے آفتاب و چندے ماہتاب ہے۔وہ سامنے آ کر بولیں۔

''بیٹی ،مجھ سے پردہ نہ کرو۔تمہارا نام ریشم ہے نا؟'' یہ پوچھتے ہوئے انہوں نے گھونگھٹ اٹھا دیا۔

''میں شہریار کی والدہ ہوں اور یہ پھوپھی ہیں۔''

ریشم نے دونوں کو آداب کہا۔بیگم بشارت اپنی دونوں ہتھیلیوں میں اس کے چہرے کو تھام کر دیکھنے لگیں۔بیگم بشارت نے محبت سے اس کی پیشانی کو چوم کر پوچھا۔

''میری بہو بنو گی؟۔''

ریشم نے شرما کر اس مہربان خاتون کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب اس کمرے میں چلے آئے۔جہاں ایمان علی ،جبار صدیقی ،رقیہ اور نثار بیٹھے ہوئے تھے۔انسپکٹر کو دیکھتے ہی ایمان علی اور نثار مجرموں کی طرح کھڑے ہو گئے۔

انسپکٹر رحمان نے بیگم بشارت سے کہا۔

''بھابی۔نثار کا جرم قابل معافی نہیں ہے۔ان دونوں میاں بیوی نے جان لینے کی کوششیں کیں۔ میں انہیں حوالات میں بند کروں گا اور عدالت تک گھسٹ کر لے جاؤں گا۔''

بیگم بشارت نے سر ہلا کر کہا۔

''آپ درست کہتے ہیں۔انہیں کڑی سے کڑی سزائیں ملنی چاہیے لیکن رحمان بھائی! یہ جیل میں جائیں

گے اور عدالت میں پہنچیں گے تو ہمارے ہی خاندان کی بدنامی ہوگی ۔ہمیں بھی ہر پیشی میں عدالت تک جانا ہو گا۔ان کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جیسے یہ پہلے بھوکے ننگے تھے۔اسی طرح اب وہی مفلسی کی زندگی گزارنے کے لیے میرے گھر سے نکل جائیں۔اب ان کے قدم میرے دروازے پر کبھی نہیں آئیں گے۔''

انسپکٹر رحمان نے کہا۔

''اچھی بات ہے۔آپ کہتی ہیں تو میں ان کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔لیکن رقیہ کے اکاؤنٹ میں جو پندرہ لاکھ روپے ہیں۔وہ کل صبح رقیہ یہ تمام رقم بنک سے نکال کر میرے حوالے کرے گی۔تب ہی میں ان دونوں کو معاف کروں گا۔''

رقیہ نے کہا۔''میں ضرور وہ روپے واپس کردوں گی ۔مگر جو دس لاکھ میری ہونے والی سوکن کو دیے گئے تھے۔''انسپکٹر نے بات کاٹ کر کہا۔

''تمہاری کوئی سوکن نہیں ہے۔جو خط تمہیں منیجر بشیر نے دیا اور میں نے بھی جو خط پیش کیا ہے۔وہ سب فراڈ ہیں۔شہر یار نے تم دونوں میاں بیوی کو آپس میں لڑانے اور اپنا بھانڈا آپ پھوڑنے کے لیے وہ جعلی خطوط لکھے تھے۔''

رقیہ کا چہرہ ایک دم سے زرد پڑ گیا۔وہ ندامت سے نثار کو دیکھنے لگی۔

انسپکٹر رحمان نے ایمان علی سے کہا۔

''ایمان علی تم بھی مجرم ہو لیکن مجرم ہونے کے باوجود تم نے شہر یار کی حفاظت کی ہے۔تمہاری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ تم نے شہر یار کی والدہ سے رابطہ قائم نہیں کیا۔میرا خیال ہے کہ بھابی تمہارے لیے سزا تجویز کریں گی۔''

ایمان علی سر جھکا کر کہنے لگا۔

''میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔شہر یار کو میں نے دوست بنا کر رکھا مگر اس کی والدہ سے دور کر دیا۔یہ کوئی معمولی جرم نہیں ہے۔مجھے واقعی سزا ملنی چاہیے۔''

بیگم بشارت نے آگے بڑھ کر کہا۔

''ہاں تمہیں سزا ملے گی۔ جیسا جرم کیا ہے ویسی ہی سزا ملے گی۔ تم نے بیٹے کو ماں سے خون کو خون سے جدا کیا ہے۔ میں بھی ایک بہن کو اس کے بھائی سے جدا کروں گی۔ تمہاری بہن کو تم سے چھین کر لے جاؤں گی۔''

ایمان علی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''آپ ایسی سخت سزا نہ دیں۔ ایسی سزا تو قانون کی کسی کتاب میں نہیں لکھی ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''قانون کا نام نہ لو۔ اگر میں نے تمہیں جیل بھیج دیا تو تمہاری بہن یہاں بے سہارا رہ جائے گی۔ اس سے بہتر انصاف نہیں ہوسکتا' تمہارے بھی خون کو تم سے جدا کیا جائے گا۔''

''ہاں ،ایمان علی!'' بیگم بشارت بولیں۔ ''تمہاری سزا یہ ہے کہ تم شہریار کو اپنے پاس رکھو۔ میں ریشم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی کل میرے ہاں آ کر تاریخ مقرر کرنا۔ شہریار کی بارات لے کر آنا۔ میں اپنی بیٹی کو دلہن بناؤں گی۔''

ایمان علی نے شدید حیرانی سے انہیں دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے۔ وہ خواب نہیں ہے۔ پھر وہ اچانک ہی آگے بڑھ کر بیگم بشارت کے قدموں پر گر پڑا اور کچھ ندامت سے کچھ احسان مندی سے اور کچھ خوشی سے بے اختیار رونے لگا۔

بیگم بشارت نے اسے قدموں سے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے آنسوؤں کا کیا مطلب سمجھوں۔ کیا تم ریشم کو میری بیٹی نہیں بناؤ گے؟۔''

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ مجھے ایسی سزا دے رہی ہیں کہ اب بھی آپ کے سامنے میرا سر نہیں اٹھے گا۔ ریشم آپ کی بیٹی ہے۔ آپ ابھی اسے لے جائیے۔ وہ اتنی خوش نصیب ہے کہ شادی سے پہلے اسے ایک ماں کی گود میں پناہ مل رہی ہے۔''

انسپکٹر رحمان نے کہا۔

''ایمان علی رونے سے کام نہیں چلے گا۔ چلو سب سے پہلے مٹھائی منگواؤ اور ہمارا منہ میٹھا کرو۔''

''جی ہاں آپ لوگ یہاں تشریف رکھیں۔ میں ابھی مٹھائی لے کر آتا ہوں۔''

جبار صدیقی نے کہا۔

''جب مٹھائی آ رہی ہے تو پھر کیوں نہ ابھی شادی کی تاریخ مقرر کر دی جائے۔''

شہر یار نے خوش ہو کر کہا۔

''آپ کے منہ میں گھی شکر۔ آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔''

بیگم بشارت نے جبار صدیقی کی طرف دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔

''آپ تو وہی ہیں نا۔ آپ نے ہی شہر یار کا ناول شائع کیا تھا۔''

''جی ہاں ، میں وہی خاکسار ہوں۔''

بیک بیک بیگم بشارت غصہ سے بھنا گئیں۔

''اچھا تو آپ پھر میرے بیٹے سے ناول لکھوانے آئے ہیں۔''

شہر یار نے جلدی سے کہا۔ ''یہ بات نہیں ہے امی یہ تو...............''

''تم چپ رہو۔'' وہ ڈانٹ کر بولیں۔ ''مجھے بے وقوف بناتے ہو۔ ایک طرف کہتے ہو کہ ریشم کو تمہارا ناول لکھنا پسند نہیں ہے۔ دوسری طرف پبلشر سے دوست کرتے ہو۔ چلو نکلو یہاں سے دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔''

انہوں نے شہر یار کو دروازے کی طرف دھکا دیا۔ پھر جبار صدیقی کی طرف بڑھیں۔ جبار صدیقی اچھل کر خود ہی دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے بولا۔

''بب ، بب بگم صاحبہ یہ کیا غضب کر رہی ہیں۔ آخر پبلشروں کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ کچھ تو خیال کیجیے۔''

''جہاں عزت ہوتی ہے۔ وہاں جاؤ تم دونوں اس معاشرے کے سب سے ناکارہ انسان ہو۔ چلو بھاگ جاؤ یہاں سے۔''

وہ آگے بڑھیں۔ شہر یار نے جبار صدیقی کا ہاتھ پکڑا اور چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ پھر کہا۔

''امی جان ،اب تو ناول مکمل ہو چلا ہے اسے قارئین کو پڑھنے دیجیے۔خود ہی فیصلہ ہو جائے گا کہ ہم دونوں ناکارہ ہیں یا ایک اچھے معاشرے کے معمار ہیں۔ بہر حال ہم جا رہے ہیں۔مگر یاد رکھیے۔میری اور جبار صاحب کی بارات ایک ہی دن نکلے گی اور ہماری دلہنیں اپنے جہیز میں کتابیں لے کر آئیں گی۔ یہ دنیا کا سب سے سستا جہیز ہے۔ایسا جہیز جو تعلیم کو فروغ دیتا ہے اور محبت کا سبق سکھاتا.................۔''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی دروازہ ایک دھڑاکے سے بند ہو گیا۔ جبار صدیقی نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''یار شہریار میاں ۔اس ملک میں ہماری قدر کیوں نہیں ہوتی ؟۔''

''جب تعلیم عام ہو گی تب ہی قدر ہو گی ۔''

''تو پھر عام کرو۔جلدی ناول مکمل کرو۔''

''بس سمجھ لو کہ مکمل ہو گیا۔اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے آپ اسے چلتے پھرتے پڑھ رہے ہیں۔''

پھر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے آگے بڑھ گئے اور چلتے پھرتے اس ناول کو اختتام تک پہنچانے کے لیے کسی ہوٹل کی تلاش میں نکل گئے۔

